☆

اشاعت کا
50 واں سال

Monthly **AWAMI JAMHURIAT**

عوامی جمہوریت

ماہنامہ جولائی/اگست 2019ء

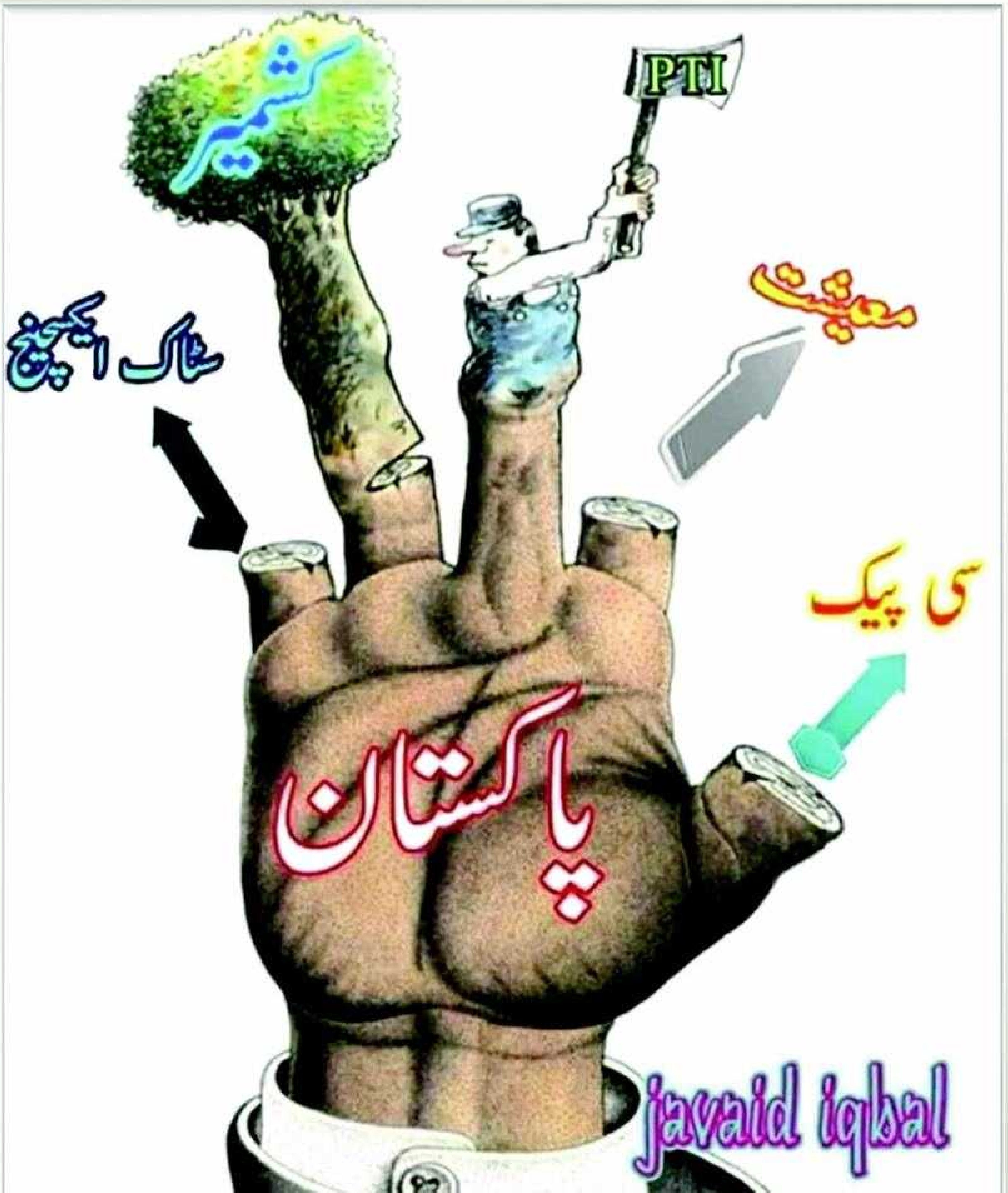

کوئٹہ

شانگلہ

ملتان

اسلام آباد

مردان

لاہور

شمارہ نمبر۔9
جلد نمبر۔15

MONTHLAY
AWAMI JAMHURIAT
LAHORE
ماہنامہ
عوامی جمہوریت
لاہور
CPL No 279

جولائی،اگست 2019
قیمت:30روپے

سرپرست اعلیٰ
عابد حسن منٹو
ایڈیٹر
اختر حسین
مجلس ادارت
مسلم شمیم، صباالدین صبا، توقیر چغتائی
اثر امام، عابد شکیل فاروقی
مینجنگ ایڈیٹر
اے آر عارف
سرکولیشن منیجر
اشتیاق اعظمی
لاہور آفس 5 میکلوڈ روڈ لاہور، پاکستان

اداریہ 1
قیام پاکستان کا سیاسی...... ڈاکٹر سید جعفر احمد 3
پاکستان کا معاشی بحران...... غلام مجتبیٰ 7
پاکستان میں سماجی تحفظ...... ڈاکٹر ریاض شیخ 12
ایک باعلم آدمی کو... نجم الحسن عطا 15
اقتصادی بحران...... ڈاکٹر توصیف احمد خان 20
عوامی لائن...... صباالدین صبا 22
نیو لبرل ازم...... خرم نیر 24
قومی سوال...... محمد سعید 26
پاکستان کی سیاست...... گلزار چنا 28
شانتا بخاری...... مہناز رحمٰن 30
FC کے فیصلے...... ادارہ 32
نظم...... خرم نیر 36

فون: 042-37353309-37357091
فیکس: 94-42-36361531
کراچی آفس: 201-204 یورو ما سینٹر نمبر 1 فاطمہ جناح روڈ صدر کراچی
Email:awami.jamhuriat@gmail.com

اداریہ

جموں و کشمیر کے عوام کا حق خود ارادیت
ایک حل طلب مسئلہ

قانون آزادی ہند ۱۹۴۷ء کے تحت اس برصغیر میں دو آزاد مملکتیں بھارت اور پاکستان وجود میں آئیں اور اس قانون کے تحت خود مختار ہندوستانی ریاستوں کو فیصلہ کرنا تھا کہ اپنی جغرافیائی حیثیت اور مذہبی اکثریت کے مدنظر وہ کس مملکت یعنی بھارت یا پاکستان کے ساتھ الحاق کرنا چاہتے ہیں جموں و کشمیر جو مسلمان اکثریتی ریاست تھی اس سے قبل کہ ریاست کے حکمران کوئی فیصلہ کرتے پاکستان کی طرف سے قبائلی لشکر کشی شروع ہوگئی چنانچہ ریاست کے حکمران مہاراجہ ہری سنگھ نے 26 اکتوبر 1947 کو بھارت کے ساتھ شامل ہونے کا اعلان کر دیا جس پر تنازعہ شروع ہوا اور دونوں ملکوں کے درمیان مسلح محاذ آرائی اور جنگی جھڑپوں کے نتیجے میں کچھ حصے پر پاکستان کا قبضہ ہوگیا اور باقی ماندہ جموں و کشمیر پر بھارت نے قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد بھارت نے جنگ بندی کے لیے اقوام متحدہ کا رخ کیا اور اس کے نتیجے میں اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل نے پہلے 20 جنوری 1948ء کو قرارداد نمبر 39 اور پھر 21 اپریل 1948 کو قرارداد نمبر 47 پاس کی جس کے تحت اس تنازعہ کے حل کے لیے پورے جموں و کشمیر میں استصواب رائے کرانا طے پایا جس پر آج تک عمل درآمد نہ ہوسکا اسی تنازعے کے مدنظر بھارت نے اپنے آئین جو 26 نومبر 1949 کو پاس ہوا میں جموں و کشمیر کو آرٹیکل 370 اور 25-A کے تحت خصوصی حیثیت دی تھی۔ آرٹیکل نمبر 370 کے چھ اہم جزئیات ہیں:

(1) بھارتی آئین کلی طور پر جموں و کشمیر کی ریاست پر لاگو نہیں ہوگا اور ریاست کو اپنا آئین تشکیل دینے کی آزادی ہوگی۔
(2) بھارتی یونین کے پاس قانون سازی کے لیے صرف تین محکمے ہوں گے یعنی دفاع، امور خارجہ اور مواصلات اس کے علاوہ تمام اختیارات ریاست کے پاس ہوں گے۔
(3) دوسرے کسی اختیار کے لیے ریاستی حکومت کی رضامندی ضروری ہوگی۔
(4) اور یہ رضامندی عبوری ہوگی جس کی بعد میں ریاست کی آئین ساز اسمبلی سے منظوری لازمی ہوگی۔
(5) ریاست کی آئین ساز اسمبلی کے خاتمے کے بعد کسی شعبے میں دخل اندازی نہیں ہوسکتی۔
(6) آرٹیکل 370 میں ترمیم کا اختیار ریاست کی آئین ساز اسمبلی کے تابع ہوگا۔

آرٹیکل 35-A جموں و کشمیر کی ریاست کو حق دیتا ہے کہ کوئی فرد ریاست کی سرکار کی منظوری کے بغیر نہ تو مستقل طور پر رہائش اختیار کرسکتا ہے نہ ہی جموں و کشمیر میں کوئی جائیداد خرید سکتا ہے۔

گزشتہ ستر برسوں سے کشمیر کے دونوں طرف کے عوام اپنے حق خود اختیاری کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں اور اس عرصے میں بھارت اور پاکستان کے درمیان پانچ مرتبہ جنگ یا تصادم ہوچکے ہیں لیکن بھارت اس مسئلے پر سیکورٹی کونسل کی قراردادوں پر عمل تو کجا شملہ معاہدے کے مطابق دوطرفہ مذاکرات کے لیے بھی تیار نہیں اور حالیہ دنوں میں بھارتی انتہا پسند اور فرقہ پرست جماعت BJP کی حکومت کی طرف سے صدارتی حکم کے ذریعے بھارتی آئین کے آرٹیکل 370 اور 25-A کا خاتمہ اور جموں و کشمیر کو بھارتی یونین کا حصہ بنانا نہ صرف اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل کی قراردادوں بلکہ خود بھارتی آئین کے بنیادی ڈھانچے کے صریحاً خلاف ہے جس کے نتیجے میں پوری وادی کے اندر خونریز مظاہرے جاری ہیں اور کئی روز سے کرفیو نافذ ہے تمام ذرائع ابلاغ پر پابندی ہے اور تمام سیاسی رہنما جیل میں ہیں۔

دوسری طرف پاکستان کا یہ مطالبہ کہ "کشمیر بنے گا پاکستان" یا یہ نعرے بازی کہ کشمیر ہماری شہ رگ ہے نے خود

پبلشر راجہ محمد ولایت نے پیپلز پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر 5 میکلوڈ روڈ لاہور سے شائع کیا۔

کشمیر کے مسئلے کی بنیادوں کو تباہ کر دیا ہے خاص کر 1980 کی دہائی سے مسلح جہادی پالیسی اور اسلام کے نام پر مسلح دخل اندازی نے نہ صرف کشمیر کے اندر بلکہ بین الاقوامی طور پر رائے عامہ کو خلاف کر دیا ہے یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ جموں وکشمیر جغرافیائی اور مذہبی طور پر تین حصوں میں تقسیم ہے یعنی جموں میں ہندو' لداخ میں بدھ اکثریت اور وادی کشمیر میں مسلمان اکثریت میں ہیں جو سیاسی طور پر خود تین حصوں میں تقسیم ہیں یعنی ایک حصہ بھارت کے ساتھ الحاق کے حق میں ہے دوسرا پاکستان کے ساتھ اور تیسرا بڑا حصہ بھارت اور پاکستان دونوں سے آزادی اور خود مختاری چاہتا ہے لہذا اگر جموں وکشمیر کے پورے عوام کو حق خودارادیت کی بات کی جائے اور سیاسی طور پر حمایت کی جائے تو یہ مطالبہ نہ صرف جموں وکشمیر کے عوام میں بلکہ بین الاقوامی طور پر بین الاقوامی قوانین کے تحت قابل قبول ہوسکتا ہے۔ بھارتی غیر آئینی اقدامات کے بعد حالیہ تنازعے میں پہلی مرتبہ پاکستان کے وزیر خارجہ جناب شاہ محمود قریشی نے کچھ حقیقت پسندانہ بات کی ہے انہوں نے آزاد کشمیر کے صدر جناب سردار مسعود خان کے ساتھ پریس کانفرنس کرتے ہوئے 12 اگست کو کہا ہے کہ ''اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں کوئی ہمارے استقبال اور گلے میں ہار ڈالنے کے لیے نہیں بیٹھا'' اور انہوں نے کہا کہ پاکستان اور کشمیر کے عوام کو کسی خوش فہمی میں نہیں رہنا چاہیے اور وہ اس مسئلے پر احمقوں کی جنت میں نہ رہیں اور یہ کہ جس کو ہم مسلم امہ کہتے ہیں اس کے سرپرست بھارت کے ساتھ بہت بڑے معاشی مفادات رکھتے ہیں انہوں نے مزید کہا کہ لوگوں کے جذبات بھڑکانا آسان ہے مگر مسئلے کی تہ تک پہنچنا اور اس کے حل کے لیے آگے بڑھنا بہت مشکل کام ہے۔ وزیر خارجہ یہ کہتے ہوئے اس حقیقت سے واقف تھے کہ حالیہ دنوں میں ہی سعودی شہزادے محمد بن سلمان کے حکم پر سعودی آرام کو کمپنی نے بھارتی ریلائنس RIL پیٹروکیمکل کمپنی میں 75 ارب ڈالر کی سرمایہ کاری کی ہے اور مزید معاہدوں کے تحت سعودی عرب پانچ سو ہزار بیرل خام تیل روزانہ RIL جام نگر ریفائنری کے لیے برآمد کرے گا۔ یہ بھارتی تاریخ کے سب سے بڑے معاشی معاہدے ہیں۔ عرب اور دنیا کے دوسرے بڑے مسلم ممالک کے مدنظر مذہب نہیں بلکہ ایک ارب آبادی کے ملک کی معاشی منڈی ہے۔ مگر ہمارے وزیر خارجہ کے بیان ایک طرف لیکن اصل حکمرانوں کو ابھی تک یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ خارجہ پالیسی کی بنیادیں مذہب اور سیکیورٹی کی بنیاد پر نہیں بلکہ معاشی تعلقات پر ہوتی ہیں۔ اگر یہ بات سمجھ میں آ جاتی تو موجودہ حکومت حالیہ دنوں میں ایسی قومی ترقیاتی کونسل قائم نہ کرتی جس میں فوج کے سربراہ اور خفیہ عسکری ایجنسیوں کے نمائندے شامل ہوتے جو خارجہ پالیسی کو بھی سیکیورٹی کے نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں اور پاکستان کے خارجی تعلقات کے طور پر اکیلے ہونے کی بھی یہی وجوہات ہیں۔ لہذا اگر پاکستان کو اس اکیلے پن سے نکلنا ہے تو پرانے تمام تصورات اور ماضی کی مغرب زدہ خارجہ پالیسی میں بنیادی تبدیلیاں لانا ہوگی اور پورے ریاستی اداروں کو نہ صرف تسلیم کرنا ہوگا بلکہ اس پر عمل بھی کرنا ہوگا کہ بین الاقوامی تعلقات کو مذہبی اور سیکیورٹی نقطہ نظر سے نہیں بلکہ معاشی بنیادوں پر استوار کیا جائے اور اندرونی اور بیرونی طور پر مذہبی منافقت اور جذباتی نعرے بازی سے نکل کر معاشی سائنس کی حقیقت کی بنیاد پر اپنی داخلی اور خارجہ پالیسیوں کو استوار کرنا ہوگا۔ لہذا خارجہ پالیسی کے طور پر کشمیر کے مسئلے کا حل بھی ماضی کے جنگی جنون کی پالیسیوں کے برخلاف سوائے اس کے کچھ نہیں ہے کہ پورے جموں وکشمیر کے عوام کو حق خودارادیت کے بنیادی حق کی سیاسی بنیادوں پر حمایت کریں اور وہاں کے عوام کو اپنی جدوجہد کی بنیاد پر فیصلہ کرنے دیں۔ بے شک یہ آزادی کی جدوجہد کٹھن بھی ہے اور طویل بھی۔

اقتصادی بحران اور عسکری اسٹیبلشمنٹ

اب یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ پاکستان کی معیشت شدید بحران کا شکار ہے اور وفاقی حکومت نے معیشت کو بحران سے نکالنے کے لیے قومی ترقیاتی کونسل قائم کی ہے اس نئے ادارے میں فوج کے سربراہ اور خفیہ عسکری ایجنسیوں کے نمائندے بھی شامل ہیں ملک کے آئین کے تحت اقتصادی معاملات پر پالیسی فیصلے کرنے کے لیے قومی اقتصادی کونسل اور صوبوں اور وفاق کے نمائندوں پر مشتمل کونسل موجود ہے ملک کی تاریخ میں پہلی دفعہ فوج کے سربراہ اور خفیہ عسکری ایجنسیوں کے نمائندوں کو اس ادارہ کا رکن بنایا گیا ہے پاکستان شاید دنیا کے چند ممالک میں شامل ہے جس کی خارجہ پالیسی بھی سیکورٹی پالیسی کے تابع ہے دنیا کے بیشتر ممالک جن میں ترقی یافتہ ممالک امریکہ' روس' چین' برطانیہ اور جرمنی وغیرہ شامل ہیں ان کی خارجہ پالیسی تجارتی پالیسی سے منسلک ہوتی ہے۔ یہ ممالک اپنے تجارتی فائدوں کے لیے خارجہ پالیسی ترتیب دیتے ہیں امریکہ اور چین کے درمیان اپنی اپنی موبائل صنعت کے تحفظ کے لیے تجارتی لڑائی ہے امریکہ اور چین نے اپنی صنعتوں کے تحفظ کر لیے ایک دوسرے کی مصنوعات پر ٹیکس عائد کیے ہیں اور قیمتی ٹیکنالوجی ان ممالک کو برآمد ہونے سے روکنے کے لیے سخت اقدامات کیے ہیں مگر پاکستان کی خارجہ پالیسی تجارتی پالیسی کے تابع نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ پاکستان سیکورٹی وجوہات کی بنا پر پڑوسی ممالک سے تجارتی تعلقات استوار نہیں کرتا پاکستان بھارت کو تجارت کے شعبے میں پسندیدہ ملک قرار نہیں دے سکا ہے بھارت کے زیر کنٹرول کشمیر میں جہادی کاروائیوں کی بنا پر دونوں ممالک کے تعلقات سرد مہری کا شکار ہیں دونوں ممالک کے درمیان تجارت بند ہے جس کا نقصان پاکستان کی سیمنٹ کی صنعت کے علاوہ کھجور اور دیگر پھل پیدا کرنے والے کسانوں کو ہو رہا ہے۔ اس پالیسی کی بنا پر امریکہ اور یورپی ممالک نے پاکستانی اشیاء پر بھاری ٹیکس عائد کیے ہوئے ہیں پاکستان مشرق بعید کی اقتصادی دہشت گردی کی روک تھام کی ٹاسک فورس کی گرے فہرست میں شامل ہے۔ اگر پاکستان نے ٹاسک فورس کی ہدایت پر اکتوبر تک عمل درآمد نہیں کیا تو پاکستان پر مزید اقتصادی پابندیاں لگ سکتی ہیں اس صورت حال میں معیشت کی بحالی کے لیے قائم ہونے والی کونسل میں فوجی افسران کی شمولیت سے ایک طرف سول

قیام پاکستان کا سیاسی و قانونی پس منظر اور اس سے حاصل ہونے والے سبق

ڈاکٹر سید جعفر احمد

اگست ۱۹۴۷ میں پاکستان کا قیام ان معنوں میں ایک منفرد واقعہ تھا کہ اس زمانے میں دنیا کے مختلف خطوں میں جو دیگر ممالک آزاد ہوئے وہ پنجۂ غلامی میں جانے سے پہلے بھی ایک ملک کی حیثیت سے اپنا جداگانہ وجود رکھتے تھے۔ ان ملکوں نے آزادی کی تحریکیں چلائیں اور کامیابی کے بعد اپنے سابقہ تشخص کو دوبارہ حاصل کرلیا۔ ان ممالک کے برعکس پاکستان ۱۹۴۷ سے پہلے کبھی بھی ایک ملک کی حیثیت سے اپنا جداگانہ تشخص نہیں رکھتا تھا۔ پاکستان میں شامل علاقے برصغیر کا حصہ تھے اور برصغیر پر ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی فوج کے ذریعے ایک سو سال کے عرصے میں اپنا قبضہ مکمل کر کے اس کو سلطنت برطانیہ کے سپرد کردیا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں یہ قبضہ مکمل ہوا اور اس کے ساتھ ہی انگریزی استعمار کے خلاف برصغیر کے طول و عرض میں آزادی کے لیے آوازیں اور تحریکیں اٹھنا شروع ہوئیں۔

۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کے نوے سال کے عرصے میں مسلم سیاسی شناخت ایک جداگانہ اور نمایاں پروگرام کے طور پر اجاگر ہوئی جس کے واضح سیاسی اور اقتصادی عوامل موجود تھے۔ انگریزی استعمار کی تعمیر و تشکیل کے دوران ابتدا ہی میں یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ اب جب کہ پہلی مرتبہ ہندوستان میں استعماری مقاصد ہی کے تحت نمائندہ اداروں کا قیام عمل میں آرہا ہے اور ساتھ ہی ایسی انتظامی اور اقتصادی پالیسیاں متعارف کی جارہی ہیں جن کے نتیجے میں شہری علاقوں میں نئی سرکاری زبان یعنی انگریزی میں دسترس رکھنے والوں کی اہمیت اجاگر ہورہی ہے اور دیہی علاقوں میں ایک نئی اقتصادی اشرافیہ وجود میں آرہی ہے، ان نئے رجحانات سے خود کو لاتعلق اور غافل نہیں رکھا جاسکے گا۔

ان دونوں سماجی طبقات کے لیے ضروری تھا کہ نئے وجود میں آنے والے نمائندہ اداروں تک پہنچ حاصل کریں تاکہ اپنے طبقات کے مفادات کا تحفظ کرسکیں۔ یہ اسی مرحلے پر ہوا کہ مسلمانوں کے بااثر طبقات کو پہلی مرتبہ ہندوستان کی مجموعی آبادی میں اپنے اقلیت ہونے کا شدت کے ساتھ احساس ہوا۔ اس احساس کا اولین اظہار سرسید احمد خان کی تحریروں میں ہوا جبکہ بعد میں مسلم سیاسی قیادت کا بڑا حصہ اور ۱۹۰۶ء میں بننے والی مسلم لیگ اس احساس کے ترجمان بنے۔

قائداعظم محمد علی جناح ایک جدید ذہن کے حامل سیاستدان تھے۔ انہوں نے وکالت کی تعلیم کی غرض سے جو عرصہ انگلستان میں گزارا وہ ان کے ذہن کی تشکیل اور ان کے سیاسی تصورات کی تعمیر میں بہت مدد و معاون ثابت ہوا۔ انگلستان میں اپنے قیام کے دوران وہ لبرل سیاسی مفکرین کے خیالات سے متاثر ہوئے۔ انہوں نے برطانوی پارلیمانی نظام کا تفصیلی مطالعہ کیا۔ ساتھ ہی انہوں نے اس نظام کی داخلی حرکیات کو بھی سمجھنے کی کوشش کی۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ برطانیہ میں مذہبی مناقشات کو حل کرنے کی غرض سے کیا اقدامات اٹھائے گئے ہیں اور یہ کہ ریاست نے خود کو مذہبی امور کے حوالے سے مکمل طور پر غیر جانبدار بنا کر اور ساتھ ہی مذہبی آزادیوں کی ضمانت فراہم کر کے معاشرے کو کس طرح دائمی امن سے ہمکنار کردیا ہے۔

ہندوستان واپسی پر قائداعظم نے جب عملی سیاست میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا تو ابتدا ہی میں ایک بہت بڑا سوال ان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ ہندوستان میں مسلمان ایک اقلیت کی حیثیت رکھتے تھے جب کہ کوئی نو دس صدیوں تک مسلمان بادشاہ ہندوستان پر حکمرانی کرتے رہے تھے۔ اس پورے عرصے میں ہندوستان کے مسلمانوں میں دیگر مذاہب کے لوگوں کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کا رجحان بھی موجود رہا تھا جب کہ اپنے مذہبی معاملات میں وہ اپنے علیحدہ طرزِ فکر و عمل کے بھی حامل رہے تھے۔ یہ دونوں رجحانات ہمیشہ ہی ایسے معاشروں میں پائے جاتے رہے ہیں جہاں ثقافتی تنوع موجود ہوتا ہے۔ ہندوستان بھی اس ثقافتی تنوع کا حامل تھا اور یہ کوئی غیر معمولی اور ہندوستان سے مخصوص بات نہیں تھی۔ لیکن انگریز کی آمد کے بعد نمائندہ اداروں کے قیام کے نتیجے میں اب جب کہ قانون سازی اور انتظامی امور کی انجام دہی ان اداروں کے سپرد ہونے والی تھی تو پہلی مرتبہ ہندوستان کا ثقافتی تنوع سیاسی تقسیم کی بنیاد بننا شروع ہوا۔

قائداعظم کا خیال تھا کہ نمائندہ اداروں میں اگر جمہوری اصولوں کو

ہندوستان کے معروضی حالات سے لاتعلق ہوکر نافذ کرنے کی کوشش کی گئی تو اس کے نتیجے میں ہندوؤں کی ثقافتی اکثریت ان کی سیاسی اکثریت کا راستہ ہموار کرے گی جب کہ مسلمان ثقافتی اقلیت ہونے کے ناطے سیاسی اقلیت بھی قرار پائیں گے۔ اس تضاد کے حل کے لیے انہوں نے جو حکمت عملی وضع کی اس کے دو نمایاں قانونی و سیاسی پہلو تھے۔ حکمت عملی کا ایک پہلو تو یہ تھا کہ قائداعظم کو معلوم تھا کہ جمہوری سیاسی نظاموں میں اس امر کی بھی گنجائش موجود ہوتی ہے کہ آبادی کے کسی حصے کی کمتر تعداد کو نسبتاً زیادہ نمائندگی دے کر اس کا اعتماد بھی حاصل کیا جاسکتا ہے اور اس کو قوم سازی کے عمل میں شریک بھی رکھا جاسکتا ہے۔ سیاسی زبان میں اس کو ایجابی اقدام (affirmative action) کہا جاتا ہے، یعنی ایسا اقدام جس کے ذریعے کسی حلقے کو اس کے منطقی حق سے زیادہ دے کر اس کے اعتماد کو جیتا جائے (اس کی ایک بہت اچھی مثال ہمارے موجودہ آئینی نظام سے دی جاسکتی ہے جس میں خواتین کو قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں عام انتخابات میں کھڑے ہونے کے حق کے باوجود اضافی طور پر سولہ فیصد نشستیں اس لیے دی گئی ہیں کیونکہ پاکستان کے پسماندہ اور مردانہ غلبے کے حامل معاشرے میں خواتین کے لیے عام انتخابات میں اس آزادی کے ساتھ مہم چلانا ممکن نہیں ہے جس آزادی کے ساتھ مرد حضرات اپنی مہم چلا سکتے ہیں)_ قائداعظم نے سیاسی میدان میں قدم رکھنے کے فوراً بعد ہی سے مسلمانوں کے لیے کسی بھی سیاسی دروبست میں ایک ایسی نمائندگی کی تجویز پیش کی جو ان کو انکی اقلیتی حیثیت کی بنا پر نظرانداز کر دیے جانے سے محفوظ رکھ سکے۔ چنانچہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تقریباً چوبیس فیصد آبادی کے لیے وہ مرکزی قانون ساز اسمبلی میں تینتیس فیصد نمائندگی کی وکالت کرتے رہے۔

یہ ۱۹۱۶ء کا لکھنو پیکٹ ہو یا ۱۹۲۷ء میں پیش کی جانے والی 'دہلی مسلم تجاویز'، قائداعظم کے چودہ نکات ہوں یا لندن کی گول میز کانفرنس کے اجلاسوں میں پیش کردہ دلائل ، یا پھر بعد کے برسوں میں سامنے آنے والے سیاسی فارمولے، کم وبیش ان تمام مراحل میں قائداعظم کی جانب سے مسلمانوں کے لیے ایک ایسی نمائندگی کے تناسب کی وکالت کی گئی جو ان کے تحفظ کی ضمانت فراہم کرسکتی۔ انہوں نے پہلے مسلمانوں کو ایک اقلیت کے طور پر پیش نظر رکھتے ہوئے اس کے سیاسی حقوق کی وکالت کی۔ اور بعد میں انہوں نے مسلمانوں کے ایک جداگانہ قوم ہونے کا موقف اختیار کیا تاکہ بین الاقوامی قوانین کی رو سے جو حقوق قوموں کو حاصل ہوتے ہیں، ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے بھی ان کی وکالت کی جاسکے۔ لیکن خواہ انہوں نے مسلمانوں کو ایک اقلیت سمجھا ہو یا ایک اگلے مرحلے پر ان کو قوم قرار دیا ہو، قائداعظم کا نکتہ نظر مذہبی منافرت پر مبنی اور فرقہ ورانہ (communal) کبھی بھی نہیں رہا۔ ان کے پورے سیاسی کیریئر کو اٹھا کر دیکھ لیں انہوں نے کبھی بھی ہندوؤں کے لیے تحقیر یا تذلیل کا کوئی ایک لفظ بھی استعمال نہیں کیا۔ تحقیر اور تذلیل تو دور کی بات انہوں نے بارہا اپنی گفتگوؤں میں اور اپنے بیانات میں ان کے لیے احترام کے الفاظ استعمال کیے_ یہاں تک کہ ۷ مارچ ۱۹۴۷ کو انہوں نے میمن چیمبر میں اظہار خیال کرتے ہوئے یہاں تک کہا کہ:

are you that I have respect for the great Hindu community and all that it stands for. They have their faith, their philosophy, their great culture; so have the Muslims, but the two are different...I am fighting for Pakistan because it is the only practical solution for solving the problem, and the other ideal of a united India and a rule based on the parliamentary system of government is a vain dream and an impossibility."

''میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں عظیم ہندو کمیونٹی اور اس سب کا جس کی کہ وہ علمبردار ہے، احترام کرتا ہوں۔ ان کا اپنا عقیدہ ہے۔ اپنا فلسفہ ہے۔ اپنا عظیم کلچر ہے۔ لیکن دونوں مختلف ہیں۔۔۔ میں پاکستان کے لیے لڑ رہا ہوں کیونکہ یہ مسئلے کا واحد حل ہے۔ اور دوسرا [حل، یعنی] متحدہ ہندوستان کا آئیڈیل اور پارلیمانی طرز حکومت پر استوار حکمرانی ایک لاحاصل خواب اور ناممکن بات ہے''۔

دیکھا جاسکتا ہے کہ تقسیم ہند سے ذرا قبل بھی جبکہ تقسیم نوشتۂ دیوار بن چکی تھی، قائداعظم کا موقف ہندوؤں سے منافرت پر نہیں بلکہ صرف اس اصول پر استوار ہوا تھا کہ اگر ماضی میں ان کے پیش کردہ تمام فارمولوں کے برعکس ایک ایسے پارلیمانی نظام پر اصرار جاری رکھا جارہا ہے جس میں اقلیت کے لیے

تحفظات فراہم نہیں کیے جارہے تو یہ نظام ہندوستان میں ناقابل عمل ثابت ہوگا۔

قائداعظم کی سیاسی جدوجہد اوران کی حکمت عملی کا دوسرااہم پہلو یہ تھا کہ بیسویں صدی کے تیسرے عشرے کے آغاز ہی میں انہوں نے یہ تجزیہ کرلیا تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے اقلیت میں ہونے کا تدارک ایک توان کی بہتر نمائندگی کی صورت میں ہوسکتا ہے (جس کا کہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے) جبکہ دوسرا اہم راستہ یہ اختیار کیا جاسکتا ہے کہ مسلم اکثریت کے صوبوں کی تعداد بڑھوائی جائے۔ یہ پہلوان کے ذہن میں اس لیے بھی اجاگر ہوا کیونکہ ۱۹۱۹ء میں متعارف ہونے والے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ جس کو مانٹیگو چیمس فورڈ ریفامز بھی کہا جاتا ہے، کو ہندوستان کی سیاسی قیادت نے صرف جزوی طور پر تسلیم کیا تھا، چنانچہ ان اصلاحات کا مرکز سے متعلق حصہ رد کردیا گیا جبکہ صوبوں سے متعلق حصے پر عملدرآمد شروع ہوگیا۔ معروف تاریخ دان ڈیوڈ پیج (David Page) نے بجاطور پر لکھا ہے کہ اس صورتحال کے نتیجے میں جبکہ مرکز کا نظام ہنوز وائسرائے کی کونسل کے ذریعے سے چلایا جارہا تھا، اور صوبوں میں انتخابات کا عمل شروع ہوچکا تھا، اور یہ انتخابات بھی ہرتین سال بعد منعقد ہورہے تھے، ہندوستان کی سیاست عملاً صوبوں میں منتقل ہوگئی۔ تب مرکز سے متعلق آئین سازی کے کام کو کسی منزل تک پہنچانے کے لیے مذاکرات اور بحث ومباحثے میں حصہ لینے کا حق بھی انہی سیاسی جماعتوں اور قائدین کو حاصل ہوسکتا تھا جن کی صوبوں میں کوئی بنیاد پائی جاتی۔ چنانچہ قائداعظم اور مسلم لیگ کی پوری کوشش تھی کہ مسلم اکثریتی صوبوں کی تعداد بڑھوائی جائے تاکہ مسلم سیاسی آواز توانا اور مستحکم بن سکے اور مرکز میں خاطرخواہ حقوق حاصل کیے جاسکیں۔ ۱۹۱۹ میں ہندوستان کے نیم وفاقی ڈھانچے میں مسلم اکثریتی صوبے صرف دو یعنی بنگال اور پنجاب تھے۔ قائداعظم نے یہ حکمت عملی اختیار کی کہ سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کرنے کا موقف اختیار کیا جائے، ۱۹۱۹ کی اصلاحات کو سرحد تک پہنچانے کا مطالبہ کیا جائے جس کا مطلب یہ ہوتا کہ شمال مغربی سرحدی خطہ بھی علیحدہ صوبہ بن جاتا۔ نیز انہوں نے بلوچستان کو بھی صوبہ بنانے کا مطالبہ کیا۔ گویاان تین نئے صوبوں کے قیام کے نتیجے میں مسلم اکثریتی صوبوں کی تعداد پانچ ہوجاتی جو وفاقی بساط پر مسلمانوں کی آواز کو کہیں زیادہ موثر بنانے کا وسیلہ بن سکتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ قائداعظم نے ہر ہر مرحلے پر صوبوں کی زیادہ سے زیادہ خودمختاری پر اصرار کیا۔

قائداعظم کی سیاسی حکمت عملی کے یہ دو پہلو جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ان کی جدوجہد کے سب سے نمایاں پہلو تھے۔ اور ان پر وہ ہمیشہ یک سو رہے۔ اور یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ انہی دو پہلوؤں سے کانگریس اور اس کی قیادت کے اغماض اور انکار نے بالآخر ہندوستان کی تقسیم کی راہ استوار کی۔ کانگریس کسی طور مسلمانوں کو ایک بہتر سیاسی و آئینی نمائندگی دینے پر آمادہ نہیں تھی۔ ساتھ ہی کانگریس کے نظریہ سازوں اور عمائدین کو یہ بات کسی طور قبول نہیں تھی کہ وہ صوبائی خودمختاری کے اس دائرہ کار کو تسلیم کرتے جس کا مطالبہ قائداعظم اور مسلم لیگ کررہے تھے۔ تقسیم ہند سے ذرا قبل کانگریس کی صفوں میں اس موضوع پر بڑا اختلاف رہا کہ کیا ہندوستان کے اتحاد کی قیمت مسلم صوبوں کو ان کی مطلوبہ خودمختاری دے کر ادا کردینی چاہیے۔ کانگریس کا ایک بڑا حلقہ جس کی قیادت ولبھ بھائی پٹیل کررہے تھے اور جس کو کانگریس کے ہمنوا صنعتی وتجارتی طبقے کی پشت پناہی بھی حاصل تھی، کا خیال تھا کہ مستقبل میں ہندوستان میں صنعتی وتجارتی سرمائے کے فروغ کے لیے ایک مضبوط مرکز کی ضرورت پیش آئے گی۔ یہ مضبوط مرکز اس حلقے کے نقطہ نظر سے ہندوستان کی وحدت کے لیے بھی ناگزیر تھا۔ اس حلقے کی یہی سوچ تھی جس پر بعد ازاں جواہر لعل نہرو کو بھی قائل کیا گیا اور پھر پٹیل اور نہرو نے مل کر گاندھی کو آمادہ کیا کہ مسلم اکثریتی صوبوں کو الگ کرنے کی قیمت ادا کردی جائے اور باقی ماندہ ہندوستان کو مستقبل میں ایک مضبوط مرکز کے تحت چلایا جائے۔ واضح رہے کہ ہندوستان کا آئین ملک کو ایک وفاق کے بجائے 'یونین' قرار دیتا ہے۔

تقسیم ہند سے قبل مسلم لیگ اور قائداعظم کی سیاسی جدوجہد کا یہ پس منظر اس امر کو واضح کرنے کے لیے کافی ہونا چاہیے کہ اس جدوجہد سے مستقبل کے لیے کس قسم کی سوچ اور سیاسی افکار کی نمو ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ قیام پاکستان کے بعد اگر ماضی کی فکر سے استنباط کی کوئی اہمیت ہے اور ہم اپنے ماضی سے کچھ سبق حاصل کرنا چاہتے ہیں تو وہ دو بنیادی سبق ہیں۔ قیام پاکستان کے مرحلے پر قائداعظم نے اپنی ۱۱/اگست ۱۹۴۷ کی تقریر میں (جس کو بدقسمتی سے بعض لوگوں نے اپنی چڑ بنالیا ہے، اوران کا بس نہیں چلتا کہ اس تقریر کو کسی طرح اوراقِ تاریخ سے حذف کردیں) بہت واضح الفاظ میں ریاست کی غیر جانبداری کے جس اصول کو انتہائی موثر انداز میں پیش کیا تھا اس کا مقصد یہی تھا کہ مذہبی تنوعات اور اختلافات سے قطع نظر ایک ایسی پاکستانی قوم کی تشکیل کی جائے جس میں سب شہریوں کو برابری کا یکساں احساس حاصل ہو۔ یہ خیال کسی بھی جدید قومی

ریاست کے ریاستی اور سیاسی درو بست میں جاری و ساری ہوتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مختلف ملکوں میں رائے عامہ اسی نکتے پر متحد ہو رہی ہے کہ شہریوں کی برابری کا اصول ایک ایسا ارفع اصول ہے جس کو یقینی بنائے بغیر نہ تو کوئی ملک اپنے استحکام کی ضمانت حاصل کر سکتا ہے اور نہ ہی ترقی کی منزلیں طے کرنے کے قابل ہو سکتا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد اس اصول پر عملدرآمد کیا جاتا تو ہم بہت سے ان بحرانوں سے بچ سکتے تھے جن سے ہمیں گزشتہ بہتر برسوں میں سامنا کرنا پڑا۔ معاشرے میں مذہبی رواداری اور ریاست و آئین کی سطح پر شہریوں کی برابری اگر عملی صورت اختیار کرتی تو آج پاکستانی معاشرے کا شیرازہ اس طرح بکھرا نظر نہ آتا جس طرح یہ نظر آتا ہے۔ ہم نے اپنی گزشتہ سات عشروں پر پھیلی ہوئی تاریخ میں مذہب کے مقدس نام پر ظلم وستم کے جو بازار گرم ہوتے دیکھے ہیں، جس طرح ایک ایک پر تشدد واقعہ میں کئی کئی سو افراد لقمہ اجل بنے ہیں، یہاں تک کہ بچوں کے اسکولوں پر حملے کیے گئے ہیں اور بچیوں کے تعلیمی ادارے مسمار کرنے سے بھی احتراز نہیں کیا گیا، یہ سب صرف اسی لیے ممکن ہوا کہ قیام پاکستان سے قبل اور عین آزادی کے موقع پر شہریوں کی برابری کے جن اصولوں کا ذکر کیا جاتا رہا ان کو ہم نے نہ تو اپنی حیاتِ اجتماعی کا حصہ بنایا اور نہ ہی ریاست نے اس چیز کو اپنے کارِ منصبی میں شامل کرنا مناسب سمجھا۔

تحریک آزادی کا دوسرا بہت اہم نظری و سیاسی اصول جس کے گرد مسلم لیگ اور قائداعظم کی سیاست تقریباً تین عشروں تک گھومتی رہی، صوبائی خود مختاری کا اصول تھا۔ قیام پاکستان سے قبل جبکہ ابھی ایک علیحدہ مملکت کا تصور اجاگر نہیں ہوا تھا اور بات متحدہ ہندوستان کے تناظر میں کی جارہی تھی، اس وقت مسلم اکثریتی صوبوں کی تعداد اور خود مختاری کا تناسب ایک اہم موقف تھا۔ لیکن پھر جب علیحدہ مملکت کی تشکیل موضوع بنی تب صوبوں کو ایک مرتبہ پھر غیر معمولی اہمیت حاصل ہوئی کیونکہ یہ مسلم اکثریتی صوبوں ہی کا فیصلہ تھا کہ وہ متحدہ ہندوستان میں رہنے کے بجائے اپنا ایک الگ وفاق تشکیل دیں گے۔ یہی نہیں بلکہ جو نئی مملکت عالم وجود میں آئی وہ اپنے جوہر میں ایک کثیر الثقافتی اور کثیر اللسانی مملکت تھی جس کے باشندوں کی اکثریت مذہب کے رشتے میں جڑے ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے جداگانہ تہذیبی و ثقافتی اثاثے کو بھی بے حد عزیز رکھتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ پاکستان میں شامل ہونے والے خطوں نے ماضی میں سیاسی جدوجہد کی بھی اپنی مخصوص تاریخیں رقم کر رکھی تھیں۔ ہمارا یہ سارا تہذیبی و ثقافتی اور تاریخی اثاثہ ہمارے ملک کو ایک عظیم الشان مملکت بنا سکتا تھا لیکن بدقسمتی سے ہماری بیشتر حکومتوں نے شدید مرکزیت پسندانہ نظاموں کے ذریعے مملکت کا نظام چلانے پر اصرار کیا۔ اس کا نتیجہ قومی وحدت کی تعمیر نہ ہوسکنے اور علیحدگی پسند رجحانات کے فروغ کی شکل میں سامنے آیا۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ پاکستان اپنی آزادی کے محض چوبیس سال بعد ایک ایسے صوبے سے محروم ہوا جو آبادی کے لحاظ سے ملک کا سب سے بڑا صوبہ تھا۔ یہی نہیں مختلف اوقات میں ملک کے دوسرے صوبے بھی وقتاً فوقتاً عتاب کا شکار ہوتے رہے ہیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود ۱۹۷۳ء کے آئین نے کسی نہ کسی حد تک صوبوں کے درمیان اتحاد کی ایک بنیاد فراہم کی ہے جس کو مضبوط بنانے کی ایک کوشش ۲۰۱۰ء میں اٹھارہویں آئینی ترمیم کے ذریعے کی گئی۔ لیکن یہ بات بھی ہمیں پیش نظر رکھنی چاہیے کہ آئین میں درج شقیں کتنی ہی متاثر کن کیوں نہ ہوں، اصل چیز ان شقوں پر عملدرآمد ہے۔ اس زاویے سے دیکھیں تو ملک میں پائی جانے والی صورت حال کسی بھی لحاظ سے قابل رشک قرار نہیں دی جاسکتی۔

اور اب جبکہ ہم اپنی آزادی کی سالگرہ منا رہے ہیں تو بہت اچھا ہو کہ ہم کچھ وقت نکالیں اور اپنے ماضی کو تازہ ذہن کے ساتھ دیکھنے کی کوشش کریں۔ اپنے ماضی کا ایک غیر جذباتی اور معروضی جائزہ یوم آزادی کا ایک اچھا مصرف ہوسکتا ہے۔ ماضی کی اپنی کامیابیوں پر خوش ہونا بالکل جائز اور مناسب ہے لیکن ساتھ ہی اپنی ناکامیوں کا ادراک اور ان کا تجزیہ بھی بہت ضروری ہے۔ کم از کم اس مضمون میں اس طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہم اپنے گزشتہ سات عشروں کے بہت سے عذابوں سے بچ سکتے تھے اگر ہم پاکستان کو ایک ایسی جدید ریاست بنانے کے راستے پر بڑھ جاتے جو شہریوں کی برابری کے اصول پر استوار ہوتی اور ریاست نے بلاوجہ مذہبی مناقشات میں ٹانگ اڑانے کی کوشش نہ کی ہوتی۔ یہی نہیں بلکہ پاکستان ایک متحد اور مستحکم مملکت بن سکتا تھا اگر ہم نے اپنے صوبوں پر شک کرنے کے بجائے ان پر اعتماد کیا ہوتا اور ان میں باہمی اعتماد کی فضا کو فروغ دینے کے لیے سیاسی اور اقتصادی اقدامات کیے ہوتے۔ مستقبل کے حوالے سے بھی یہی دو نکات توجہ کے مستحق ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ آج ہم جشن آزادی کے موقع پر چند لمحے اس موضوع پر سوچنے کے لیے بھی نکال سکیں۔

☆☆☆

پاکستان کا معاشی بحران اور سوشلسٹ متبادل

غلام مجتبیٰ صدر عوامی ورکرز پارٹی، لاہور mujtabag@hotmail.com

معاشی بحران راتوں رات تو پیدا ہوتے نہیں۔ برسہا برس کی پالیسیوں کے نتیجے میں ابھرنے والے بحران پر ایسے سر پیٹنا کہ جیسے یہ کسی ایک حکومت یا ایک فرد کے رویوں کے نتیجے میں رونما ہو گئے ہوں درست اندازِ تجزیہ نہ ہوگا۔ اگر ہم ان عوامل کی نشاندہی کر پائیں جو آج کے معاشی بحران کے ذمہ دار ہیں تو اس کے کسی متبادل کے بارے میں بات کرنا آسان ہو سکتا ہے۔

موجودہ معاشی پالیسیوں کی ابتدا 35 برس قبل سن 80 کی دہائی کے زمانے سے ہوئی جب آئینِ پاکستان میں درج۔ خاص طور پر آرٹیکل 3 میں دیئے گئے۔ راستے سے انحراف کرتے ہوئے 180 درجے الٹ راستہ اختیار کیا گیا۔ ساختی ردوبدل structural adjustment کے نام پر سب کچھ تلپٹ کر دیا گیا۔ عالمگیریت globalisation کے زیر اثر ایک انجان فریم ورک اختیار کیا گیا جس کے نتیجے میں جو پالیسیاں ہمارے لیے وبالِ جان ثابت ہوئیں وہ یہ تھیں۔

پالیسی ناکامیاں Policy Failures

پہلا یہ سوچا گیا کہ ریاستی کردار کو زیادہ سے زیادہ محدود کر دیا جائے اور اسے سکیورٹی کی ذمہ داری کے علاوہ قانون سازی، ٹیکس اکٹھا کرنے اور ریگولیٹری ادارے چلانے کا کام سونپا جائے۔ خیال تھا کہ اس سے بجٹ میں بہت بڑی بچت ہوگی لیکن ایسا ہو نہ سکا اور ملکی بجٹ اب بھی بہت بڑے خسارے سے دوچار ہے۔

دوسرا یہ کہ معیشت کے کنٹرول کا جھکاؤ ٹیکس آمدن و خرچ کو قابو کرنے یعنی fiscal policy سے زرومال کے پھیلاؤ کو قابو کرنے یعنی monetary policy کی طرف ہو گیا۔ اب محکمہ خزانہ کی بجائے سٹیٹ بنک کو ملکی اقتصادیات کو آگے پیچھے کرنے کی قدرت زیادہ حاصل ہے۔ لیکن بوجوہ ہمارا مرکزی بنک اس ذمہ داری کو ادا کرنے میں کامیاب نہیں رہا۔ خاص طور پر ایکسچینج کی شرح ہو، ایکسچینج کا کنٹرول ہو، کرنسی کا پھیلاؤ ہو، کریڈٹ کنٹرول ہو، سرمایہ کاری کا ماحول پیدا کرنا ہو۔ سٹیٹ بنک مارکیٹ قوتوں اور افواہ سازوں اور کرنسی کے ذخیرہ اندوزوں speculators کے سامنے مؤثر ثابت نہیں ہوا۔

تیسرا یہ طے ہوا کہ کاروباری و صنعتی اداروں کو پبلک سیکٹر سے فارغ کیا جائے۔ قصور یہ نکالا گیا کہ یہ قومی خزانے پر بوجھ ہیں۔ یہ بھی نہ دیکھا گیا کہ کونسا ادارہ منافع بخش ہے اور کونسا نہیں۔ یوں قومی اثاثوں کو بے دریغ لٹایا گیا۔ جو رہ گئے وہ بے توجہی کے باعث ضائع ہو گئے اور آج قومی خزانے پر واقعی بوجھ ہیں۔

چوتھا یہ ہوا کہ ٹیکسوں کا ایک ایسا نیا نظام وضع کیا گیا جو ملکی منڈی کو عالمی منڈی سے جوڑ دے اور ہمارے ملک میں عالمی پیداوار کی کھپت کے راستے میں ہر کاوٹ کو دور کر دے۔ اس میں کافی پیش رفت ہوئی اور ملکی پیداوار کا نظام عالمی پیداوار کے سامنے شکست کھا گیا۔ کاٹیج انڈسٹری یعنی گھریلو صنعت تو کیا درمیانہ انٹرپرائز بھی مسابقت سے باہر ہو گیا۔

پانچواں یہ ہونے دیا گیا کہ سماجی شعبوں جیسے علاج معالجہ اور تعلیم کو منڈی کی بے رحم لوٹ مار کرنے والی قوتوں کے حوالے کر دیا گیا۔ نتیجہ یہ کہ اچھی تعلیم اور اچھا علاج معالجہ بالائی طبقات کی دسترس میں چلا گیا اور نچلے طبقات اس سے محروم ہو گئے۔

چھٹا یہ اختراع پیش کی گئی کہ طلب کو ریگولیٹ کرنے کی ضرورت نہیں بس رسد کو بڑھانے کی طرف توجہ دی جائے۔ یعنی معیشت کا رخ demand side سے supply side کی طرف موڑ دیا گیا۔ ہم ترقی کے اس سراب کی طرف آنکھیں بند کر کے بھاگے۔ پتہ تب چلا جب احساس ہوا کہ بجلی ہو پانی ہو یا زرعی پیداوار ہو ایک حد سے زیادہ ان کی رسد نہیں بڑھ سکتی۔ جب تک طلب کو قابو میں رکھنے کا خیال آیا تب تک دیر ہو چکی تھی۔

ساتواں یہ کوتاہی کی گئی کہ نجی طبقہ جب تیزی سے ابھرا تو قومی پالیسی کی گائیڈ لائنز ترتیب نہ دی گئیں۔ نجی طبقہ کی خودغرضی اور حرص کے آگے ریاست نے ہتھیار ڈال دیئے اور ایسے میگا پراجیکٹ بنائے گئے جن میں ملکی و غیر ملکی کمپنیاں پیسہ بنائیں۔ تھرمل بجلی گھر دیکھ لیں موٹرویز کا جال دیکھ لیں۔ ملکی مفاد کہہ لیں عوام کا مفاد کہہ لیں ان کا خیال نہیں رکھا گیا۔ توانائی کے سستے ذرائع کو نظر انداز کیا گیا جبکہ آمدورفت اور نقل و حمل کے سستے اور پائیدار ذرائع کو چھوڑ

دیا گیا۔ ہائیڈرو پاور پر تھرمل بجلی گھروں کو ترجیح دی گئی جو کپیسٹی چارج لیتی ہیں بھلے ملک قرضے کے بھنور circular debt میں پھنس جائے اور کبھی اس کی جان نہ چھوٹنے پائے۔ پانی کو ذخیرہ کرنے کے بجائے اور نہروں کو تروتازہ رکھنے کے بجائے ایسے چلن کو پروان چڑھایا گیا جس سے ٹیوب ویلوں کے ذریعے زیرِ زمین پانی برباد ہو گیا۔ ریل پر موٹروے کو ترجیح دی گئی۔ جواز یہ پیش کیا گیا کہ موٹروے کے کنارے صنعتی زون بنیں گے جو اک سراب سے کم نہیں تھا۔ وہ ریل جس نے ہندوستان کو متحد کیا وہ ریل جو چلتے تو ملکی ترقی کا پہیہ کبھی رکنے نہ پائے آج وہ دگرگوں حالت میں پہنچ چکی ہے تو پھر یہ حال تو ہونا ہی تھا جس میں آج ہم خود کو پاتے ہیں اور وجہ ایک دوسرے میں بحث کر کے ڈھونڈتے ہیں۔

آٹھواں یہ ہوا کہ ہم اپنے قدرتی وسائل کی حفاظت میں بری طرح ناکام رہے۔ ابھی تہذیب نے جنم بھی نہیں لیا تھا کہ انسان کو چار عناصر کی اہمیت کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ کائنات کی ہر شے ان چار عناصر سے مل کر بنی ہے۔ وہ عناصر تھے پانی مٹی آگ ہوا۔ آج بھی ان کی اتنی ہی اہمیت ہے۔ پانی سے مراد لے لیں وہ محدود پانی کا ذخیرہ جو انسان کی ضرورت کے مطابق قابلِ استعمال ہو اور جس میں کم از کم فی کس دستیابی کے لحاظ سے تیزی سے کمی ہو رہی ہے۔ مٹی سے مراد لے لیں زرعی زمین جو تیزی سے برباد ہو رہی ہے یا معدنیات جو تیزی سے ناپید ہو رہی ہیں۔ آگ سے مراد لے لیں توانائی کے ذرائع جو لامحدود نہیں ہیں۔ اور ہوا سے مراد لے لیں ماحولیات جو ہم تیزی سے کھو رہے ہیں اور اس کی بربادی میں اپنا قصور بھی نہیں مان رہے۔

نواں یہ خطا سرزد ہوتی چلی آ رہی ہے کہ جن قدرتی وسائل سے انسان کو مالا مال کیا گیا ہے ان میں ایک وسیلہ ایسا ہے جس کی اہمیت کی طرف ہم میں سے کسی کی توجہ نہیں ہے اور وہ تیزی سے معدوم ہو رہا ہے۔ اور وہ وسیلہ ہے بائیوڈائیورسٹی biodiversity یعنی نباتات وحیوانات کا تنوع۔۔ جسے قدرت نے کروڑوں برس کی محنت سے ارتقا کا عمل بروئے کار لا کر ہمارے لئے اس دنیا کو سجایا ہے۔ اور جس کے بغیر کئی اور جانداروں کے ساتھ ساتھ نسلِ انسانی کے معدوم ہو جانے کا حقیقی خطرہ موجود ہے۔ ہماری جدید زراعت کی بنیاد بائیوڈائیورسٹی کے ضیاع loss of biodiversity پر اٹھائی گئی ہے۔ نتیجہ زہریلی خوراک اور صحت کے گوناں گوں مسائل کی شکل میں ہم بھگت رہے ہیں۔ کبھی مالتھوز Malthus کے نظریے کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا جو یہ کہتا ہے کہ آبادی کا تناسب اگر حد سے بڑھ جائے تو قدرت قحط، جنگ اور بیماریوں کے ذریعے آبادی اور خوراک کے مابین توازن کو قائم کرتی ہے۔ پھر سبز انقلاب کی ٹیکنالوجی کا راج آیا تو انسان خوراک کے مسائل سے غافل ہو گیا۔ اب پھر آبادی آگے آگے اور خوراک پیچھے پیچھے ہے۔

دسواں یہ ہوتا آ رہا ہے کہ ہم اپنے مالیاتی وسائل کی حفاظت میں ناکام رہے اور قانونی اور غیر قانونی دونوں طریقوں سے سرمائے کا انخلا یعنی سرمائے کی پرواز capital flight ہوتی رہی اور ہم دم سادھے رہے۔ ایسی کھلی چھٹی 1991 میں بنائے گئے اقتصادی اصلاحات کے قانون کے تحت دی گئی جو نئے اقتصادی آئین نو New Economic Order کے عین مطابق تھا۔

گیارھواں یہ ستم کہ آبادی کی افزائش کے مسائل سے ہم یکسر غافل ہیں۔ آبادی کا حجم، آبادی کا پھیلاؤ، آبادی کی مائیگریشن، آبادی کی تربیت، آبادی کا کارآمد ہونا۔۔ کچھ بھی ہماری دانش کا حصہ نہیں ہے۔ یاد رکھیں مستقبل میں خوراک اور توانائی۔۔ یعنی food and fuel کی یقینی رسد یا دستیابی ہی سکیورٹی کی ضمانت ہو گی۔ ویانا کے ایک تھنک ٹینک کے مطابق کوئی تین دہائیوں کے بعد دنیا دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ ایک وہ جنہیں خوراک پر دسترس حاصل ہو گی حالانکہ ان کے گھر میں خوراک ضروری نہیں کہ پیدا ہوتی ہو اور دوسرے وہ جو خوراک پر دسترس نہیں رکھتے ہونگے حالانکہ ان کے گھر میں خوراک کے ڈھیر پیدا ہوتے ہونگے۔

بارھواں یہ ستم ظریفی کہ ہمارا لائف سٹائل تین دہائیوں میں چھا جانے والی کہہ لیں کہ سستی درآمد شدہ اشیا سے عبارت ہے۔ خوراک کو ہی لے لیں۔۔ اناج کو چھوڑ کر کے دالیں خوردنی تیل دودھ گوشت سبزیاں اور پھل تک کھلے بندوں درآمد ہوتے ہیں۔ ان درآمدات کو قابو میں لانے کا ایک طریقہ تو اب سٹیٹ بنک ایکسچینج کی شرح میں ردوبدل کر کے نکالے گا ہی۔ لیکن ہم میں سے کوئی بھی ان اشیا سے پرہیز کرنے کی طرف راغب نہیں ہے۔ ایک چائے ہی کو لے لیجئے اس کے کئی مقامی اور صحت مند متبادل موجود ہیں لیکن ہم ڈالروں سے خریدی گئی اس چائے سے روز نہاتے رہتے ہیں۔ سماج میں کوئی تحریک موجود نہیں ہے کہ مقامی متبادل استعمال کئے جائیں۔ نتیجہ یہ کہ آہستہ آہستہ ہم ایک کنزیومر سوسائٹی میں بدل گئے۔ پیداواری عمل بالکل رک گیا۔ آپ دیکھئے کہ 70 کی دہائی میں بجلی کی نصف پیداوار صنعتوں میں استعمال ہوتی تھی جو اب گھٹ کر ایک چوتھائی رہ گئی ہے۔ تب 17 فیصد بجلی کی پیداوار گھروں میں استعمال ہوتی تھی جو اب بڑھ کر کل پیداوار کا نصف ہو چکی ہے۔ جس ملک میں نجی بجلی گھروں یعنی IPPs میں آگ جلا کر بنی انتہائی مہنگی بجلی کی پیداوار کا نصف گھروں میں استعمال ہو وہ ملک کیا چلے گا اور کیا ترقی کرے گا۔ جہاں دن کے وقت گھروں دفتروں اور عمارتوں میں بجلی جلا کر انہیں روشن رکھا جائے اور ایک

ایک عمارت میں دسیوں بیسیوں اے سی لگا کر اسے ٹھنڈا رکھا جائے اس ملک کا خدا ہی حافظ ہے۔ اس رجحان کو جلد از جلد پلٹا دینے کی اشد ضرورت ہے کیونکہ ان کا توانائی بچاؤ متبادل موجود ہے۔

تیرھواں یہ دھوکا کہ اب تک کی طرزِ افزائش growth strategy بری طرح ناکام ہوئی ہے۔ محض کچھ اعداد وشمار کی جمع تفریق اور ضرب تقسیم سے گروتھ ریٹ طے کرنے سے جو تاثر پیدا ہوتا ہے وہ اس لئے کامیاب نہیں کہلا سکتا کہ ایک تو جو منصوبے چلائے جاتے ہیں وہ اُس طرح سے پیدا آور نہیں ہوتے جس طرح سے ان کے بارے میں اندازہ لگایا جاتا ہے۔ دوسرا اس گروتھ سٹریٹجی میں یہ منعکس نہیں ہوتا کہ معیشت کو پیداواری شعبے چلا رہے ہیں یا بیکار قسم کا غیر مستعد سروس سیکٹر بوجھ بنا ہوا ہے۔

ہماری معیشت مسلسل قرضوں کے بوجھ تلے دبتی جا رہی ہے۔ آج ہماری معیشت 35ھزار ارب روپے اور 100 ارب ڈالر کے زیرِ بار ہے۔ آج ہم قرضہ واپس لوٹانے کی کیپسٹی نہیں رکھتے تو کل اس سے زیادہ قرضہ لوٹانے کی سکت کیسے رکھیں گے؟ یاد رکھیں قرضوں میں کمی آئے بنا ہم مزید سانس بھی نہ لے پائیں گے۔ لیکن قرضوں میں کمی اس دن آنا شروع ہوگی جب ہم مزید قرض لینے سے احتراز کریں گے اور اپنے وسائل کے اندر رہ کر اپنا گذارہ کریں گے اور اپنی ترقی کی منصوبہ بندی کریں گے۔۔ جس کے آثار فی الحال تو نظر آ نہیں رہے۔

اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم اگلی نسلوں کے حصے کے وسائل بھی ہضم کر چکے ہیں۔ یہاں ایک مثال یاد آ گئی جو یہاں پر بالکل فٹ آتی ہے۔ ایک ہوٹل کے باہر ایک دعوتی بورڈ آویزاں تھا کہ آیئے خوب کھایئے بل کی فکر نہ کریں بل آپ کا پوتا دے گا۔ ایک صاحب اس فریب کے چکر میں آ گئے۔ خوب کھا کر جب نکلنے لگے تو ہوٹل کے سٹاف نے بل تھما دیا۔ گاہک نے جب احتجاج کیا کہ یہ تو وعدے کی خلاف ورزی ہے تو اسے بتایا گیا کہ یہ اس کا بل نہیں بلکہ اس کے دادا کا بل ہے جو کبھی اس ہوٹل میں کھانا کھانے آئے تھے۔ آج ہمیں اپنے دادا کا بل بھی ادا کرنا ہے اور یہ فیصلہ بھی کرنا ہے کہ اس پریکٹس کو اب یہیں دفن کر دیا جائے اور آئندہ کے لئے بل اپنے پوتے کے لئے نہ چھوڑا جائے۔ گویا ہمیں ڈبل بل ادا کرنے کے لئے ذہنی طور پر تیار رہنا ہوگا۔

آج کا معاشی بحران محض بتائے گئے مالیاتی قرضوں کا بحران ہی نہیں ہے بلکہ ہر نامراد پالیسی نے جن کا ذکر ہم نے ابھی کیا ہے الگ الگ سے اپنی نہ دکھنے والی قرض کی دبیز تہہ چڑھائی ہے۔ یہ سب کچھ جدید سرمایہ داری کے چلن کی اندھی تقلید کا نتیجہ ہے۔ جس کے نتیجے میں عالمی سرمایہ داری نظام ہمارے جیسے ترقی پذیر ملکوں کو تجارت وسرمایہ کاری کے چکر میں اور نجکاری کی آڑ میں قیمتی اثاثوں اور وسائل سے محروم کر رہا ہے اور غلامی ومحتاجی کی کھائی میں دھکیل رہا ہے۔۔ جس سے بچنے کی اشد ضرورت ہے۔

اس کا سوشلسٹ متبادل آج بھلے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ پرولتاریہ کی آمریت قائم ہونے سے کم اس کا کوئی متبادل ہم پیش ہی نہیں کر سکتے۔ ہاں۔۔ ہر وہ حل جو محنت کش طبقے کو آسودگی فراہم کرے، اس کو اس کی محنت کا صحیح معاوضہ دلائے، اس کے روزگار کو یقینی بنائے، اس کے بچوں کا مستقبل محفوظ بنائے، کام کر کے دنیا کو رونق بخشنے والے کو امن اور خوشحالی کی نوید سنائے۔۔ ہر وہ قدم جو قدرتی وسائل اور اقتصادی اثاثوں کو محفوظ بنائے اور انہیں سماجی طور پر زیادہ زیادہ مشترک بنائے یعنی socialise کرے۔۔ وہی آج کا سوشلسٹ متبادل گنا جانا چاہئے۔ اس کے لئے ہم کچھ رہنما پالیسی خاکے گوش گذار کرنا چاہیں گے۔

آج کا میثاقِ اشتراک Socialist Charter

(1) پائیدار ترقی اور اس کے ثمرات کو امن سے مربوط کیا جائے۔ ہمسایوں سے کشیدگی اور گھر میں مارا ماری اور عدم برداشت کے ماحول میں یہ ممکن نہیں ہوگا۔ ہمسایہ ممالک کے ساتھ ڈائیلاگ کو فروغ دیا جائے۔ اور یہ اس وقت ہوگا جب ہمسایہ ممالک کی امن دوست تنظیموں سے عوامی سطح پر رابطے مضبوط کئے جائیں گے اور امن وخوشحالی کے مشترک آدرشوں کو آگے بڑھایا جائے گا۔

(2) دھرتی ہماری ماں ہے۔ اگر یہ ہماری ماں ہے تو اس کی خرید وفروخت کیوں ہوتی ہے اور اس کی قیمتیں آسمان سے کیوں باتیں کرتی ہیں اور معدودے چند لوگ اس پر قابض کیوں ہیں۔ زمین پر ریاستی کنٹرول کے بغیر آئندہ کوئی ایسا منصوبہ کامیاب نہیں ہونے والا جس میں زمین کو شامل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ سب کو خوراک نہیں ملے گی، سب کو رہائش نہیں مل پائے گی۔ لہذا نیا بندوبستِ اراضی متعارف کرانے کی اشد ضرورت ہے تاکہ زمین سب کے فائدے کے لئے استعمال ہو۔ اصول یہ ہو کہ دھرتی سب کی لیکن کسی ایک کی نہیں۔ اور یہ تب ہی ہو سکتا ہے جب زمین کی نجی ملکیت کے اصول کو اب خیر باد کہہ دیا جائے۔ زرعی زمینوں کو کوآپریٹو کی طرز پر منظم کیا جائے جس سے کسانوں کو اِن پُٹ اور آؤٹ پُٹ کی لاگت کے مسائل سے نمٹنے میں مدد مل سکے۔ جب کہ شہری علاقوں میں سرکاری یا کوآپریٹوز کی ملکیت رہائشی بستیاں لیزنگ کے نظام کے تحت استعمال اور ضرورت کی حد تک الاٹ کی جائیں۔

(3) شہروں کی افزائش پر روک لگا دی جائے اور جہاں ممکن ہو بدنظمی کی شکار شہری آبادیوں کی ترتیبِ نو کی جائے۔ چند برس کے اندر ہماری بستیاں

کوڑے کرکٹ میں دبنے اور گندے پانی میں ڈوبنے والی ہیں۔ ابھی سے منصوبہ بندی کر کے پچھلی گندگی کو ٹھکانے لگانے اور آئندہ کی گندگی کو قابو میں رکھنے کی سعی کی جائے۔

(4) انسانی آبادی اور وسائل کی منصوبہ بندی کر کے روزگار، صحت تعلیم رہائش اور ٹرانسپورٹ تک نچلے طبقے کی دسترس یقینی بنائی جائے۔ انسانی آبادی کے حجم، انسانوں کی مائیگریشن اور انسانی آبادی کے مستقبل کی منصوبہ بندی کی جائے۔ پہلی ناقص مائیگریشن وہ ہے جس میں ملک کے اعلیٰ پڑھے لکھے دماغ جن پر ملک کا کثیر سرمایہ خرچ ہوا ہوتا ہے وہ ملک سے ہجرت کر جاتے ہیں۔ دوسری ناقص مائیگریشن وہ ہے جہاں لوگ ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں روزگار کی تلاش میں جا بستے ہیں۔ تیسری ناقص مائیگریشن وہ ہے جس میں آبادی دیہاتوں علاقوں سے شہروں کی طرف منتقل ہوتی رہتی ہے۔ ان سب پر روک ٹوک لگائے بِنا ہم کسی بھی طرح کی منصوبہ بندی کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ تصور کتنا بھیانک معلوم ہوتا ہے کہ چند برس میں آبادی کا حجم دگنا ہو جائے گا۔ اس کے لئے ابھی سے ہنگامی بنیادوں پر منصوبہ بندی کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ ابھی سے اہداف مقرر کئے جائیں کہ آبادی میں افزائش کو کتنے برسوں میں ہم روک پائیں گے اور پھر کتنی آبادی کب تک رول بیک roll back کر پائیں گے۔

(5) قدرتی وسائل کی حفاظت کی جائے اور انہیں اگلی نسلوں کی امانت سمجھا جائے۔ جنگلات کو زراعت سے بھی زیادہ اہمیت دی جائے۔ زراعت کو ثمر آور بنانے اور کسانوں کے حقوق کا تحفظ کرنے کے لئے اسے کوآپریٹوز کی بنیاد پر منظّم کیا جائے۔ زرعی زمین پر آبادیوں کی چڑھائی روکی جائے اور بڑے شہروں کا پھیلاؤ روک کر سمارٹ شہر بسائے جائیں۔ ماحولیات کو قیمتی اثاثہ سمجھا جائے اور اگلی نسلوں کے لئے ایک امانت بھی۔ بائیوڈائیورسٹی biodiversity کی حفاظت کی جائے اور زراعت کے فطری طریقے کی طرف جلد از جلد لوٹ جایا جائے۔ پانی کے وسائل کی بوند بوند منصوبہ بندی کی جائے۔ صاف اور قابلِ استعمال پانی کی انمول دستیابی کی طرف لوٹ آیا جائے۔

(6) آج ترقی کا تصور ایک کھلی نمود و نمائش اور وسائل کے ضیاع پر مشتمل ہے جسے درست کئے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اسے دوام پذیر ترقی sustainable development کے تصور سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت ہے۔ آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم چاند کو چھونا چاہیں اور ہمارے پاؤں زمین پر ٹکے ہوئے نہ ہوں۔ فوڈ ٹیکنالوجی کو ہی لے لیجئے اس نے صحت کے گونا گوں مسائل پیدا کئے ہیں اور ہم پوری طرح اس کی لپیٹ میں ہیں۔

(7) قومی اثاثے کسی بھی معیشت کی ساکھ ہیں انہیں ضائع نہ کیا جائے۔ قومی ادارے اگر بدانتظامی کا شکار ہیں تو ان کے ایک چوتھائی حصے تک نجی شعبے کو شامل کر کے پبلک پرائیویٹ طرز پر انتظام کر کے انہیں منافع بخش بنایا جا سکتا ہے۔ مزید قومی ادارے ملکی معیشت کو مضبوط کریں گے اور یہی اثاثے آگے چل کر قرضوں کا مقابلہ کرنے کی سکت پیدا کرنے میں مدد کریں گے۔

(8) قرضوں پر معیشت کا انحصار کم سے کم کیا جائے۔ اس کے لئے قومی بچت کی شرح میں اضافہ کیا جائے اور اسے ہمسایہ ممالک کی شرح کے برابر کیا جائے۔ اور یہ کوئی اتنا عجب نسخہ بھی نہیں ہے۔ بھارت میں یہ شرح قومی پیداوار کے 26 فیصد کے لگ بھگ ہے جبکہ پاکستان میں یہ اب مشکل سے 16 فیصد تک پہنچی ہے۔ ٹیکسوں کا مزید بوجھ بڑھاتے وقت اس بات کا خیال رکھا جائے کہ یہ ان طبقات پر منتقل کیا جائے جو اسے برداشت کرنے کی سکت رکھتے ہیں اور جنہوں نے پچھلی چار دہائیوں میں دن دگنی رات چگنی ترقی کی ہے۔

(9) منصوبے ترجیحات سامنے رکھ کر بنائے جائیں اور ایسے بنائے جائیں کہ اس میں سرمائے کی کم اور لیبر کی آمیزش زیادہ ہو یعنی یہ لیبر انٹنسیو labour intensive ہوں تاکہ روزگار کے مواقع زیادہ سے زیادہ پیدا ہوں۔ اس کے لئے منصوبہ بندی کے شعبے کو پھر سے توانا اور بااختیار بنانا ہوگا جسے گلوبلائزیشن کے زیرِ اثر کمزور کر دیا گیا ہے۔ ویسے سوال یہ اٹھتا ہے کہ اگر منصوبہ بندی سے کام لینے کے بجائے وزیرِ اعظم اور وزیرِ اعلیٰ کے directives یعنی ہدایاتِ عالیہ کے مطابق منصوبے چلنے ہیں تو پھر وفاقی و صوبائی سطحوں پر منصوبہ بندی کے محکموں کو بند کر دیا جائے تاکہ اربوں روپے کے بجٹ کی بچت ہو سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ تقریباً تمام بڑے منصوبے منصوبہ بندی کے ماہرین کی سفارش کے برعکس حکامِ بالا کے براہ راست اشاروں پر چلائے گئے۔ موٹر وے اور میٹرو منصوبے اس چلن کی گھناؤنی مثالیں ہیں۔ منصوبہ بندی کے شعبے کا بنیادی کام کسی بھی منصوبے کی لاگت اور آمدنی کا اندازہ لگا کر اپنی سفارشات تیار کرنا ہے اور پھر ان کی روشنی میں وفاق میں پلاننگ کمیشن اور صوبوں میں پلاننگ و ڈویلپمنٹ بورڈ ان منصوبوں کی منظوری دیتا ہے۔

(10) یقینی اور باقاعدہ روزگار پیدا کرنے والے نظام کی طرف بڑھا جائے۔ اس وقت پڑھے لکھے بیروزگاروں کی کھیپ پر کھیپ تیار ہو رہی ہے۔ ان کے لئے NDVP کی طرز پر بیشک علامتی معاوضوں پر ٹریننگ اور تجربہ حاصل کرنے والے پروگرام شروع کئے جائیں۔ خواتین کے لئے خاص طور پر ووکیشنل پروگراموں کا دائرہ وسیع کیا جائے۔ بیروزگار خواتین اور بوڑھوں کے لئے پنشن مقرر کی جائے۔ یہ ہمارے آئین کے مندرجات کا تقاضا بھی ہے۔

(11) خوراک کے مستقبل کا تحفظ کیا جائے۔ ہماری معیشت میں

خوراک کی قیمتوں کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اگر خوراک مہنگی تو ہر چیز مہنگی۔ خوراک کی قیمتوں میں اضافے کو تشویش کی نگاہ سے دیکھا جائے اور ضروری ہو تو راشن بندی سے کام لیا جائے۔ کھانے پینے کے غیر صحت مند کلچر پر قدغن لگائی جائے۔

(12) پائیدار انفراسٹرکچر بنایا جائے اور اس کی حفاظت بھی کی جائے۔ ریل کو سڑک پر ترجیح دی جائے اور پچھلی نسلوں کی بدانتظامی کا بوجھ اگلی نسلوں کو منتقل نہ کیا جائے۔ سوشل انفراسٹرکچر بھی زمانے سے کہیں پیچھے رہ گیا ہے۔ اسے تیزی سے آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔

(13) توانائی پر انحصار کم کیا جائے اور اس کا بہتر استعمال کیا جائے۔ ایسے گھر اور ایسی عمارتیں بنائی جائیں جو توانائی پر کم سے کم انحصار کریں۔ توانائی کے متبادل ذرائع کو استعمال میں لایا جائے۔ توانائی کی لاگت کا تعین توانائی کی متبادل صورتوں کو سامنے رکھ کر کیا جائے۔ قدرتی گیس کو کم سے کم جلایا جائے اور تنوروں اور بھٹیوں میں تو بالکل بھی نہیں۔ فطرت کے قریب رہنے کا کلچر فروغ دیا جائے۔ سورج طلوع ہو اٹھیں سورج غروب ہو سونے کی تیاری کریں۔ چوبیس گھنٹے چلنے والے میڈیا پر روک ٹوک لگائی جائے۔

(14) سرکاری اداروں کی کارکردگی بہتر بنائی جائے، انہیں عوام کا خدمت گذار بنایا جائے۔ سول اور عسکری اداروں کا سائز سمارٹ اور مستعد بنایا جائے۔ سیاسی جماعتیں اور سماجی گروپ اداروں کی کارکردگی پر نظر رکھیں۔ ان اداروں کی نااہلی اور خراب کارکردگی کا خمیازہ بالآخر عوام کو بھگتنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر بجلی کے محکمے کی خراب کارکردگی و لوٹ کھسوٹ پر اگر عوام دوست سیاسی جماعتیں نظر نہیں رکھیں گی تو پھر کون رکھے گا؟

(15) سکول کا نام کالج اور کالج کا نام یونیورسٹی رکھ دینے سے علم کی دنیا ترقی نہیں کر جاتی۔ اس فریبِ نظر سے بچا جائے۔ یونیورسٹی کو تحقیق و تخلیقِ علم کا بسیرا بنایا جائے۔ اس کے بغیر یونیورسٹی یونیورسٹی کہلانے کی مستحق نہیں۔ یونیورسل نظامِ تعلیم کی طرف بڑھا جائے۔ ہائر سیکنڈری تک تعلیم لازمی اور مفت کی جائے۔ جب منڈی کی قوتیں کمزور ہوں گی اور انقلاب کے آثار جنم لینا شروع کریں گے تب ہم چاہیں گے کہ ہر سطح تک تعلیم مفت کر دی جائے۔ سکول کو بارھویں گریڈ تک بڑھایا جائے اور تیرھویں گریڈ سے آگے تعلیم یونیورسٹی کی ذمہ داری ہو۔ یوں کالج کی سطح سے جان چھڑا لی جائے۔ مسجد و مدرسہ دونوں سے سکول کا کام لیا جائے۔ سکولوں میں دباؤ کم کرنے کے لئے دوسری شفٹ متعارف کرائی جائے۔ ابتدائی تعلیم مادری زبان میں دی جائے۔ انگریزی زبان کی تعلیم چھٹی جماعت سے شروع کی جائے جو میٹرک تک جاری رہے۔ انٹر کی سطح پر فنکشنل انگلش پر زور دیا جائے اور اس کے بعد پیشہ ورانہ مضامین کے علاوہ اور کچھ نہ پڑھایا جائے۔

(16) پرہیز علاج سے بہتر ہے کے سنہری اصول کو اختیار کیا جائے۔ علاج معالجے پر خرچ ہونے والی رقم کا ایک حصہ ہائی جین بہتر بنانے پر خرچ کیا جائے تاکہ مہنگے علاج معالجے سے بچ سکیں۔ ہسپتالوں کے آؤٹ ڈور شعبوں میں دباؤ کم کرنے کے لئے ڈبل شفٹ چلائی جائے۔ تشخیصی شعبوں میں جہاں لیبارٹری میں یا مشینوں پر ٹسٹ ہوتے ہیں وہاں دن رات کام کیا جائے۔

(17) حادثہ غریب کی دنیا مٹا دیتا ہے۔ کوئی معاوضہ زندگی یا صحت کا متبادل نہیں ہو سکتا۔ ان کی کثرت کا نوٹس لیا جائے۔ اس کے لئے نیشنل سیفٹی کونسل قائم کی جائے جو مختلف معیار قائم کرے اور گھر میں، کام کی جگہوں پر اور سڑکوں پر کارکنوں اور شہریوں کی زندگی کو محفوظ بنائے۔ کام والی جگہوں پر حادثے کی صورت میں کارکنوں کو معاوضوں کی ادائیگی کا ایسا نظام بنایا جائے جو آجروں کے انشورنس پریمئم سے ادا ہو۔ اگر حادثہ نہ ہو تو انشورنس کی شرح کم ہوتی جائے اور حادثے کی صورت میں انشورنس کی شرح آجروں کے لئے جرمانے کے طور پر بڑھتی جائے۔

(18) کسی مفتی صاحب کی جو شاہ ولی اللہ یا حسرت موہانی یا عبیداللہ سندھی جیسے روشن خیال عالم کے پیروکار ہوں ان کی خدمات حاصل کی جائیں اور انہیں اس بات پر فتویٰ دینے پر قائل کیا جائے کہ پاکستان کے سادہ لوح عوام کی رہنمائی کریں تاکہ وہ کثیر تعداد میں حج عمرہ قربانی پر اٹھنے والے اخراجات کو پاکستان میں ادھورے فلاحی کاموں یا ہسپتالوں کی بہتری پر خرچ کریں اور بیٹھے بٹھائے اتنا ہی ثواب حاصل کریں۔ ویسے بھی ایک مقروض ملک کے مقروض شہری پر کہاں فرض ہے کہ وہ ملک کا قرضہ اتارنے کی فکر کرنے کے بجائے قیمتی سرمایہ اور زرمبادلہ خرچ کرتے ہوئے حج عمرہ قربانی کی طرف رجوع بھی کرے۔ اس تحریک کے آغاز میں کم از کم یہ تو کریں کہ کوئی ایک سے زیادہ عمرہ یا حج نہ کرے یا ایک سے زیادہ جانوروں کی قربانی محض نمود و نمائش کے طور پر نہ کرے۔

تو جناب یہ ہے آج کا 'سوشلسٹ' متبادل جس کے لئے ہر ترقی پسند کارکن کو آواز بلند کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ یہ زمانے کا تقاضا بھی ہے۔ اس کے بغیر اب آپشن کم ہی بچے ہیں۔ ہماری رائے ایک دن پالیسی سازوں کی رائے بنے گی اور ہم خاک نشین بھی کبھی اچھی زندگی کا خواب دیکھ پائیں گے۔ ☆☆

پاکستان میں سماجی تحفظ کا تصور

ڈاکٹر ریاض احمد شیخ

پاکستان تحریک انصاف نے اپنے انتخابی منشور اور عمران خان نے گزشتہ کئی برس اور خصوصاً انتخابی مہم کے دوران سب سے زیادہ زور دو باتوں پر دیا تھا اوّل ملک سے بدعنوانی/کرپشن کا خاتمہ اور دوئم ملک میں مغربی طرز کی فلاحی ریاست کا قیام۔ بعدازاں انہوں نے اس جدید فلاحی ریاست کے تصور کو عوام میں مقبول بنانے اور کسی حد تک مذہبی حلقوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے ''ریاست مدینہ'' کے نام سے پکارنا شروع کیا ان کا دعویٰ تھا کہ ملک کے سابقہ حکمرانوں نے بدعنوانی اور کرپشن کے ذریعے اربوں ڈالر کمائے اور اس کے نتیجے میں ملک کنگال ہوا اور عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کچھ نہ کیا گیا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ ان کی حکومت کیونکہ انتہائی ایماندار اور صالح افراد پر مشتمل ہوگی جن کا دامن کرپشن سے داغ دار نہیں ہوگا اس طرح کرپشن سے بچا ہوا پیسہ وہ عوام کی فلاح و بہبود پر خرچ کرتے ہوئے مدینہ کی ریاست کی طرح پاکستان کو بھی ایک فلاحی ریاست بنا دیں گے جہاں تمام شہریوں کو یکساں تعلیمی نظام فراہم کیا جائے گا ہسپتالوں میں علاج معالجے کی سہولیات بھی میسر ہوں گی لوگوں کو کاروبار کے لیے بلاسود قرض فراہم کیے جائیں گے۔ بے گھر افراد کو گھر فراہم کیے جائیں گے اسی طرح کے کئی دیگر دعوے عمران خان کے پسندیدہ دعوے تھے تو اب سوال یہ ہے کہ ایک برس گزر گیا ہے اس دوران پی ٹی آئی کی حکومت اپنا پہلا بجٹ پیش کر چکی ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ عمران خان اور ان کی حکومت نے اپنے پہلے بجٹ میں سماجی تحفظ اور فلاحی ریاست کے قیام کے اپنے دعوے کو پورا کرنے کے لیے کس قسم کے اقدامات کیے۔ اس سے قبل ہم جدید ریاست میں سماجی تحفظ کے تصور پر تھوڑی بات کریں گے بعدازاں پاکستان میں سماجی تحفظ کے تصور اور پھر پی ٹی آئی کی طرف سے اس برس کے بجٹ میں سماجی تحفظ کی مد میں اٹھائے گئے اقدامات کے متعلق بات کریں گے۔

سماجی تحفظ کا تصور:

اقوام متحدہ کے ادارہ برائے سماجی ترقی کے مطابق ''سماجی تحفظ دراصل کسی بھی معاشرے میں ایسے افراد یا گروہوں کی ضرورت پورا کرنے کا عمل ہے جو کسی بھی وجہ سے اپنی ضروریات پوری کرنے کے قابل نہ ہوں ان وجوہات میں تعلیم، بیروزگاری، بیماری، معذوری، ضعیف العمری، بڑھتی ہوئی مہنگائی یا افراط زر جیسے دیگر کئی عوامل شامل ہیں۔

ایسی صورت حال میں یہ ریاست کی ذمے داری بنتی ہے کہ وہ اپنے ایسے شہریوں کو جو اوپر بیان کی گئی صورت حال کے باعث اپنی ضروریات پوری نہ کر سکتے ہوں تو پھر ریاست اپنے وسائل سے ان شہریوں کی ضروریات پوری کرنے کی ذمہ دار ہوگی۔

جدید ریاست میں سماجی تحفظ کا ارتقا:

جدید ریاست کی تاریخ میں سماجی تحفظ کا تصور سب سے پہلے جرمنی میں متعارف کرایا گیا جرمن چانسلر بسمارک نے اپنے دور اقتدار میں سب سے پہلے سماجی تحفظ کا تصور پیش کیا یہ بات بڑی اہم ہے کہ اس نے یہ تصور اپنے عوام سے ہمدردی رکھتے ہوئے پیش نہیں کیا تھا بلکہ یہ قدم یورپ میں ابھرتی ہوئی انقلابی صورت حال کو روکنے کے لیے اٹھایا گیا تھا۔ ۱۸۵۰ء کے بعد مارکس کی تحریروں کے نتیجے میں یورپ میں انقلابی صورت حال بنتی جا رہی تھی اور محنت کش سرمایہ داروں کے استحصالی نظام کے خلاف احتجاج کرنے لگے تھے اور کسی بھی سماجی تحفظ کی عدم فراہمی کے باعث محنت کش بڑی مشکل صورت حال کا سامنا کر رہے تھے۔ فیکٹریوں اور کارخانوں میں انتہائی خطرناک ماحول میں کام کرنے کے باعث وہ ہمیشہ خطرے کی حالت میں رہنے پر مجبور تھے کارخانوں میں حادثات معمول کی بات تھی جس کے باعث ان کی اموات یا پھر ان کے جسمانی اعضا کٹ جانے کے واقعات کوئی انوکھی بات نہیں تھے کان کنی سے وابستہ محنت کش بھی آئے دن حادثات کا شکار ہوتے تھے جبکہ سرمایہ دار ان حادثات کی ذمے داری کسی صورت لینے کو تیار نہ تھے اس لیے محنت کشوں کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا اور سوشلسٹ اور کمیونسٹ خیالات مقبول عام ہوتے چلے جا رہے تھے۔

تصادم کی اس صورت حال کو کم کرنے کے لیے بسمارک نے جرمنی میں سماجی تحفظ کے کئی قوانین کا نفاذ کر دیا۔ ۱۸۸۳ء میں (جس برس عظیم انقلابی کارل مارکس کا انتقال ہوا) اس نے بیمار افراد کے علاج معالجے کی فراہمی کا قانون بھی متعارف کروایا جبکہ ضعیف العمر اور معذوروں کی صورت حال میں تحفظ فراہم کرنے کا قانون بھی متعارف کرایا گیا۔

۱۹۳۰ء کی دہائی میں سرمایہ دار دنیا میں کساد بازاری کا ایک بھیانک مرحلہ سامنے آیا اور اس سے سب سے زیادہ متاثر امریکہ ہوا کساد بازاری کے اس دور میں سرمایہ داروں نے محنت کشوں کو کسی بھی قسم کا تحفظ فراہم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس صورت حال میں امریکی ماہر معاشیات جان میرن کینز (Jhon Mayren Keynes) نے سرمایہ دارانہ نظام کو مکمل تباہی سے بچانے کے لیے فلاحی ریاست کا تصور پیش کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ معاشی نظام کو ایڈم اسمتھ کے آزاد معاشی نظام کے تصور کے تحت منڈی کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جاسکتا بلکہ ریاست کو اس میں مداخلت کرنا ہوگی کیونکہ اگر ریاست اس میں مداخلت نہیں کرے گی تو سرمایہ دار اپنی لالچ اور مزید منافع کے حصول میں محنت کشوں کا شدید استحصال کریں گے اور معاشرے میں سماجی ناہمواری تیزی سے بڑھے گی اور اس کے نتیجے میں سماجی تضاد بڑھ کر سماجی تصادم کی صورت اختیار کرلے گا اور یہ صورت حال بلاآخر انقلاب کی صورت حال اختیار کرلے گی جس کے نتیجے میں سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ ہوسکتا ہے یاد رہے کہ یہ وہ دن تھے جب سوویت یونین میں کامریڈ لینن کی رہنمائی میں انقلاب آچکا تھا اور چند ہی برسوں میں سوویت یونین نے ایک جاگیردارانہ سماج سے ایک سوشلسٹ نظام قائم کرلیا تھا۔ معاشرے سے استحصال کا نظام ختم کیا جاچکا تھا۔ تمام شہریوں کو روزگار، تعلیم، صحت اور رہائش کی سہولیات حاصل ہوچکی تھیں۔ اس انقلابی صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے مغربی یورپ اور امریکہ میں فلاحی ریاست کا تصور متعارف کرایا گیا۔

سماجی تحفظ کی اقسام:

سماجی تحفظ کی کم از کم تین اقسام ہمارے سامنے ہیں:

۱۔ منڈی میں مداخلت: اس تصور کے تحت ریاست بیروزگاری کے عمل کو روکنے کے لیے محنت کشوں کو ملازمت کے مواقع فراہم کرے گی سرمایہ داروں کو محنت کشوں کو بیروزگار کرنے سے روکنے میں اپنا کردار ادا کرے گی یا پھر محنت کشوں کے لیے روزگار کو یقینی بنائے گی۔

۲۔ سماجی انشورنس: اس مد میں ریاست بیماروں، معذوروں اور معاشرے کے کمزور طبقات کو صحت، تعلیم وغیرہ کی سہولتیں فراہم کرنے کی ذمہ دار ہوگی۔

۳۔ سماجی مدد: اس کے تحت ریاست کے وہ افراد جو اپنی ضروریات پوری کرنے کے قابل نہ ہوں ان کی مدد کرے گی۔ کسی بھی حادثے یا قدرتی آفات کی صورت میں ریاست مدد کرنے کی ذمہ دار ہوگی یہ تصور اب دنیا کے بیشتر ترقی یافتہ اور اب ترقی پذیر ممالک میں رواج پا رہا ہے۔

پاکستان میں سماجی تحفظ کا ارتقا: پاکستان کے ابتدائی برسوں میں دیگر نو آبادیاتی ریاستوں کی طرح کوئی توجہ نہ دی گئی۔ ایوب خان کے نام نہاد سرسبز انقلاب اور ترقی کی دہائی کے دوران ناہموار سماجی ترقی کے باعث پاکستانی معاشرے میں سماجی ناہمواری مزید بڑھی اور دولت چند بڑے خاندانوں اور خصوصاً ۲۲ خاندانوں میں مرکوز ہونے کی بات سامنے آئی اور اس صورت حال کے باعث ۱۹۶۸ء میں ایوب خان کے خلاف ایک بڑی تحریک سامنے آئی جس میں دیگر طبقات کے ساتھ ساتھ محنت کش بھی بھرپور سرگرم عمل تھے مشرقی پاکستان میں مولانا بھاشانی نے سرمایہ داروں کے خلاف تحریک شروع کی جبکہ موجودہ پاکستان میں بھی انقلابی صورت حال بن چکی تھی جس کے باعث ایوب خان کو بالآخر مستعفی ہونا پڑا اور حکومت یحیٰی خان کے ہاتھ لگی۔

۱۹۷۰ء کے انتخابات میں ملک سے استحصالی نظام کا خاتمہ ایک مقبول نعرہ بن گیا بھٹو نے مشرقی پاکستان کے علیحدہ ہونے کے بعد موجودہ پاکستان کا اقتدار سنبھالا یہاں محنت کش اور عوام بھٹو کو مجبور کر رہے تھے کہ وہ اپنے انتخابی منشور پر عمل کرتے ہوئے ملک میں فلاحی نظام متعارف کرائے۔ اس طرح پاکستان میں سماجی تحفظ کا نظام کا ذکر پہلی بار سامنے آیا ملک میں کئی نجی کارخانوں، بینکوں اور دیگر اداروں کو قومیا لیا گیا اور اس طرح محنت کشوں کو نہ صرف ملازمتیں فراہم کی گئیں بلکہ ملازمتوں میں تحفظ بھی فراہم کیا گیا۔

۱۹۷۳ء کے آئین میں پہلی مرتبہ سماجی تحفظ کے تصور کو متعارف کرایا گیا پاکستان کے آئین میں آرٹیکل ۳۸ درج کیا گیا جس میں شہریوں کو روزگار، تعلیم، صحت، اور دیگر امور کو فراہم کرنے کی بات کی گئی لیکن اس کو بنیادی حقوق کی فہرست میں درج نہیں کیا گیا بلکہ اس کو ''پالیسی اصول'' کی فہرست میں رکھا گیا اس کے ساتھ ساتھ دیگر کئی اقدامات اٹھائے گئے یا پھر ان کو مزید بہتر کیا گیا جن میں ای او بی آئی، سوشل سیکورٹی، ورکرز ویلفیئر فنڈ وغیرہ جیسے ادارے متعارف کرائے گئے جس سے کسی حد تک محنت کشوں اور شہریوں کو فوائد پہنچے لیکن ان کا دائرہ کار بہت محدود رہا۔

جنرل ضیاالحق کے دور میں قومیائے گئے ادارے پرانے مالکان کو واپس کرنے کا عمل شروع ہوا تو دوسری طرف اسلامائزیشن کا عمل آگے بڑھا گیا گیا دیگر اقدامات کے ساتھ ہی اسلامی تصور کے تحت بیت المال اور زکوٰۃ کا نظام متعارف کرایا گیا اور کہا گیا کہ اس کے توسط سے ضرورت مندوں کی مدد کی جائے گی لیکن اس کا کوئی خاص فائدہ سامنے نہیں آیا کیونکہ زکوٰۃ سے غیر مسلم شہری مستفید

نہیں ہوسکتے تھے اسی طرح شیعہ مسلمانوں نے بھی زکوٰۃ کے نظام میں شریک ہونے سے انکار کردیا اس طرح اس کا دائرہ محدود ہوگیا لیکن یہ بڑے پیمانے پر کرپشن اور بدعنوانی کے واقعات سامنے آئے زکوٰۃ کمیٹی کے افراد مقامی نظام کا حصہ تھے اور بڑے پیمانے پر کرپشن کے باعث عام لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔

۱۹۸۸ء میں جنرل ضیا کی ہلاکت کے بعد پاکستان آئی ایم ایف کے پاس امداد کے لیے پہنچا۔ آئی ایم ایف نے قرض کی شرائط میں سب سے اہم شرط ملک میں نج کاری کے عمل کو آگے بڑھانے کی رکھی اور اگلے دس برسوں میں نجکاری کے نتیجے میں ہزاروں محنت کش بیروزگار ہوئے اور ملک میں سماجی ناہمواری مزید ابتر ہوگئی ۔ جنرل مشرف کے ساتھ آئی ایم ایف اور عالمی بنک کے نمائندوں یعنی شوکت عزیز' ڈاکٹر حفیظ شیخ اور ڈاکٹر عشرت حسین جیسے لوگوں نے بڑے اہم عہدے حاصل کر لیے اور ملک میں نیولبرل معیشت کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

۲۰۰۸ء میں پیپلز پارٹی کی حکومت کے بعد ۲۰۰۹ء میں سماجی تحفظ کے ایک بڑے پروگرام ''بینظیر انکم سپورٹ'' پروگرام کا قیام عمل میں لایا گیا اس پروگرام کے تحت اس ضرورت مند خاتون کو تین ماہ کے لیے ایک ہزار روپے فراہم کیے جاتے تھے جو بعد ازاں بڑھ کر دو ہزار روپے ہوئے ۔ مسلم لیگ کی حکومت نے اس کو پانچ ہزار روپے تک کردیا۔

موجودہ بجٹ میں سماجی تحفظ کے لیے متعارف کرائے گئے اقدامات:

آئی ایل او (ILO) کی ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق پاکستان دنیا کے ان چند ممالک میں شامل ہے جو سماجی تحفظ کی مد میں انتہائی کم رقم خرچ کرتے ہیں ان کی ۱۹-۲۰۱۷ء کی رپورٹ کے مطابق پاکستان اپنے GDP کا صرف اعشاریہ دو فیصد ۰ء۲ سماجی تحفظ پر خرچ کرتا ہے جو کہ انتہائی کم ہے اس کے نتیجے میں آبادی کا صرف ۳ء۲ فیصد اس سے مستفید ہوتا ہے جس میں اکثریت ان پنشنرز کی ہے جو کہ اپنی سرکاری ملازمتوں کے بعد پنشن کے حقدار ہیں اس میں سول اور فوجی اہل کاروں کی بڑی تعداد شامل ہے اس کے مقابلے میں جنوبی ایشیا کے دیگر ممالک میں اس سہولت سے مستفید ہونے والے شہریوں کی ایک بہت بڑی تعداد شامل ہے مثلاً پاکستان میں چوبیس اعشاریہ ایک فیصد 24.1 شہری' سری لنکا میں 33.1 فیصد' بنگلہ دیش میں 33.4 فیصد شہری اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن اس خطے میں سب سے زیادہ بہتر صورت حال نیپال کی ہے جہاں بادشاہت کے خاتمے کے بعد اور کمیونسٹ پارٹی کے اقتدار میں آنے کے باعث سماجی تحفظ سے مستفید ہونے والے شہریوں کی تعداد سب سے زیادہ یعنی 62.5 فیصد ہے حالانکہ پاکستان کے مقابلے میں نیپال زیادہ پسماندہ اور غربت کا شکار رہا ہے۔

گذشتہ ماہ اعلان کیے گئے بجٹ میں پی ٹی آئی کی حکومت نے سماجی تحفظ کی مد میں اپنے دعوؤں کے برعکس کوئی خاص اقدامات نہیں کیے انہوں نے بینظیر انکم سپورٹ کی مد میں فراہم کی جانے والی رقم میں صرف پانچ سو روپے کا اضافہ کیا ہے یعنی اس بجٹ سے قبل تین ماہ کے لیے پانچ ہزار روپے دیے جاتے تے اور اب یہ رقم پانچ ہزار پانچ سو ہوگی یہ اضافہ صرف ۱۷۰ روپے ماہانہ بنتا ہے۔ اسی طرح پہلے سے متعارف شدہ اسکیم جو کہ بچیوں کو اسکول بھیجنے والے غریب خاندانوں کو مالی مدد فراہم کرتی تھی اس رقم کو تین ماہ کے لیے ۷۵۰ روپے سے بڑھا کر ایک ہزار روپے کردیا ہے جو بمشکل ۸۰ روپے ماہانہ بنتے ہیں اسی طرح نواز شریف حکومت کے دور میں متعارف کرائے گئے صحت کارڈ کا نام بدل کر انصاف کارڈ کردیا گیا اور اس کا دائرہ کے پی کے چند اضلاع تک بڑھا دیا گیا ہے۔

اسی طرح عمران خان نے بے گھر افراد کے لیے کم لاگت کے گھروں کی بات کی تھی اب گزشتہ ہفتہ اس اسکیم کی تفصیل سامنے آنے کے بعد یہ بات کھلی کہ اس اسکیم پر عمل درآمد بحریہ ٹاؤن کے ملک ریاض کی مدد سے کیا گیا جائے گا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حکومت اس پروگرام پر عمل کرنے میں کتنی سنجیدہ ہوگی ملک ریاض اور بحریہ ٹاؤن نے خود زمینیں قبضہ کرکے اور لوگوں کو دھونس دھمکی اور فراڈ کے کاروبار میں ملوث ہیں اس اسکیم کے سائے میں وہ مزید کس قدم کی صورت حال بڑھائیں گے اس کا اندازہ کرنا زیادہ مشکل نہیں ہے۔

حکومت نے ایک اور دعویٰ کیا ہے کہ وہ اپنے اقدامات اور اقتصادی صورت حال کو بہتر بنا کر ایک برس میں ملک کو غربت کی لکیر سے نیچے رہنے والی آبادی جس کا تناسب 38.8 فیصد ہے اس کو کم کرکے تیس فیصد تک لے آئیں گے۔ لیکن بجٹ میں متعارف کرائے گئے اقدامات اور کاروبار کے سست پڑنے کے باعث ہزاروں محنت کش پہلے ہی بیروزگاری کا شکار ہوچکے ہیں اور ان میں مزید اضافہ کے واضح اشارے مل رہے ہیں اس صورتحال میں غربت میں کمی کی بات دیوانے کی بات سے زیادہ کچھ نہیں۔ ہاں یہ ضرور ممکن ہے کہ غربت کے خاتمے کے نعرے کے باعث کچھ اعلیٰ بیوروکریٹس اور اسمبلی کے اراکین کو ملازمتیں مل سکیں کیونکہ حکومت نے ملک میں غربت کے خاتمے اور سماجی تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے ایک جدا وزارت بنانے کا اعلان کیا ہے یقیناً اس میں ایک وفاقی وزیر ممکنہ طور پر وزیر مملکت اور اس وزارت کے لیے سیکریٹری جوائنٹ سیکریٹریز اور دیگر افسران کی ایک بڑی تعداد تعینات کی جاسکتی ہے اس طرح سے ملک سے غربت کے خاتمے کے نام پر پی ٹی آئی کی حکومت کچھ ایم این اے اور بیوروکریٹس کو ملازمتیں ضرور فراہم کرسکتی ہے جبکہ پاکستانی عوام اسی طرح بدحالی کا شکار رہیں گے بلکہ خطرہ اس بات کا ہے کہ آئی ایم ایف کی نمائندوں کی حکومت میں موجودگی کے باعث صورت حال مزید گمبھیر صورت اختیار کرسکتی ہے جس کا سامنا کرنے کے لیے عوام کو متحد ہوکر جدوجہد کرنا ہوگی۔ ☆☆

ایک باعلم آدمی کو یہ علم ہونا چاہیے کہ وہ کتنا لاعلم ہے

نجم الحسن عطا

دریائے راوی کے ''کناروں پر سینکڑوں جھونپڑے ہیں جن میں ہزاروں افتادگان سسک سسک کر زندگی گزار رہے ہیں۔انہیں حکمران مون سون کے موسم میں انتباہ کرتے آئے ہیں کہ سیلاب آفت کی صورت میں آنے والا ہے، ''جگہ خالی کرو'' کسی بھی خادمِ اعلیٰ کو یہ علم ہی نہیں کہ یہ خاک بسر ''کہاں جائیں'' جن کی زندگی ایسی کئی آفات سے ہرلحہ پنجہ فگن رہتی ہے جہاں موت اور زندگی میں کوئی فرق نہیں' تو پھر انہیں کیا معلوم کہ موت ایک حادثہ ہے زندگی گزارنا کمال ہے اس لیے پاکستان کا غریب جوہڑوں کا پانی پی پی کر موت کے حادثوں کا شکار رہتا ہے۔اشرافیہ طبقہ جو برسرِ اقتدار رہا ہے جس کے ذمے مہاتیر محمد جیسا کام سپرد تھا لیکن اس طبقے نے سو100 ارب ڈالر کا ملک کو مقروض کردیا ہے۔اب لبرل اور کچھ بائیں بازو کے افراد وزیراعظم عمران خان کے دس ماہ کی گنتی میں مشغول ہیں اور اُن لٹیروں کا بین السطور ساتھ دے رہے ہیں جن کے بارے میں وہ خود جانتے ہیں کہ سب کتنے پانی میں ہیں جو دو ہفتے کا زرِمبادلہ چھوڑ کر رات ہی رات میں ذی شرف ہوگئے ہیں۔یہ خالی خزانہ ایک ایسے شخص کے سپرد کر گئے ہیں جو نہ تو سیاست داں ہے اور نہ انقلابی۔تاہم بھیک مانگ کر ملک کو دیوالیہ ہونے سے بچالیا گیا ہے۔انقلاب کا موسم روٹھ گیا ہے اور نہ قبائلی' جاگیرداری اور نیم سرمایہ دارانہ نظام میں مارکسی انقلاب آنے کی جلد امید نظر آتی ہے جبکہ سابق سوویت یونین کا انہدام دنیا کے غریبوں کو لاوارث چھوڑ گیا ہے۔پاکستان میں کچھ لبرل اور کچھ بائیں بازو کے افراد 'خدا کی مخلوق' کی اصطلاح کی آڑ میں ہرزہ سرائی کرتے رہتے ہیں۔وہ شاید یہ نہیں جانتے کہ عالمی سطح پر چوتھی نسل کی علمی اور تیکنیکی صنعت کاری کے عہد میں اسلحہ کی بھیانک ''دوڑ'' میں اگر پاکستان پیدل چلے گا تو اس پس ماندگی کو ترقی روندڈالے گی اب ترقی کسی پس ماندہ علاقے یا ملک کو آزاد نہیں چھوڑے گی۔اِسی تناظر میں بات کو آگے بڑھاتے ہیں۔

پاکستان کی پس ماندگی سماجی یا تاریخی ارتقاء کی کوئی فطری یا لازمی منزل نہیں یہ ایک مخصوص سماجی صورت ہے جو نوآبادیاتی غلبے کی وجہ سے جاری ہے اور جدید نوآبادیاتی تسلط کی وجہ سے جو ممالک قرضوں کے عادی ہیں وہ ڈالر کی عاشقی میں مبتلا ہو کر کرپشن اور غربت کو انتہا تک پہنچا چکے ہیں۔سامراجی امداد اور قرضے سے متعلق تحقیق نے یہ ثابت کیا ہے کہ بیرونی امداد اور قرضوں جدید سامراجی تسلط کو جاری رکھنے کے اہم ترین ہتھیاروں میں سے ایک ہیں۔ڈاکٹر فیروز احمد اپنی کتاب ''سامراج اور پاکستان'' میں لکھتے ہیں:

کہ ''رجنی پام دت کی کتاب' انڈیا' میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ برطانوی سامراج نے کس طرح ہندوستان کے تاریخی ارتقاء میں دخل اندازی کر کے اس کے سماجی ڈھانچے کو توڑ مروڑ کر اپنے مفادات کے تابع کردیا تھا اور کس طرح ہمیں پس ماندگی اور محتاجی ورثہ میں دے دی۔

اسی دوران دوسری عالمی جنگ کے بعد امریکہ کو عروج ملا اور ایک نیا سامراج اُبھرا جس نے اقوامِ عالم پر تسلط کو ایک نئی شکل دی۔جس نے پاکستان کی پسماندہ اور طبقاتی صورتحال (تقسیم کے بعد) کو اپنے حواری حکمرانوں کے ذریعے معاشی اور سیاسی پیچیدگی سے دوچار کردیا۔برطانیہ چونکہ براہ راست راج کر رہا تھا اس لیے اس کا کام آسان تھا۔امریکہ نے باہر سے بیٹھ کر پاکستان میں اپنی مرضی کے سامراجی ادارے قائم کیے۔جنہوں نے پاکستانی معیشت کو اپنے تابع کیا۔تاہم غیر ملکی امداد اور قرضوں نے پاکستان کی معیشت کو کس طرح مفلوج کیا اور حکمرانوں نے اپنے حصے کی کس طرح بندر بانٹ کی جس کے نتیجے میں ملٹری سول بیوروکریسی جاگیردار اور قبائلی سرداروں نے مسلم لیگ اور جماعتِ اسلامی جیسی دائیں بازو کی پارٹیوں کے ساتھ مل کر پاکستان کی اُن آوازوں کو دبا دیا اور ان کو پابندِ سلاسل کیا جنہیں دارورسن کی آزمائش سے گزرنا پڑا' یہ بھی حقیقت ہے کہ سابق سوویت یونین کے خوف سے سرد جنگ میں دائیں بازو کی حکومتیں

دنیا بھر میں محنت کشوں کی یکجائی سے ہراساں تھیں اور ایسے ضابطے مغرب میں بنائے گئے جو محنت کشوں کو بہتر ماحول کی ترجمانی کرتے تھے۔ لیکن تیسری دنیا اور پاکستان جیسے ملکوں میں بائیں بازو کو کچلنے کی پالیسی جاری رکھی جس وجہ سے پاکستان میں سچ کی شکست ہوئی اور جھوٹ حاوی آ گیا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ حکمراں طبقوں کے ساتھ سامراجی مفادات کو ہم آہنگ کرنے کی کامیابی کے بعد صنعتی اور زرعی معیشت کے لیے جو قراردادیں امریکا میں پاس کی گئیں اور جو حربے PL480 کے تحت سستی گندم پاکستان کو روپے کی شکل میں دی گئی بعد ازاں 80 فیصد ڈالر مانگے گئے۔ یہ وہ معاشی تاریخ ہے اگر اس میں تمام شعبوں کا تجزیہ بھی کیا جائے اور ملٹی نیشنلز فارماسوٹیکلز کمپنیوں کی منافع خوری کو بھی بیان کیا جائے تو لازماً پاکستان میں انقلابِ فرانس کی نوید سُنائی جاسکتی ہے۔

ڈاکٹر فیروز احمد 1971ء میں لکھتے ہیں کہ ''جو دوا ایک روپے کی امریکا میں دستیاب ہے، پاکستان میں 79 روپے کی ملتی ہے''۔ اِس ایک مثال سے بہت کچھ واضح ہوجاتا ہے کہ لوٹ مار سے پاکستان میں ابتدا جس ٹولے نے کی، وہ اب تک حکمران ہے۔

صنعت میں اسٹیل مل اور تعلیم میں انجینئرنگ کی مخالفت کی گئی اور قرضوں کی یہ شرط کہ کوئی ایسی شے نہ بن پائے جو امریکا کا مقابلہ کرتی ہو، اس کے علاوہ زراعت میں ایسے حربے استعمال کیے جو ہمارے حکمرانوں کے لیے باعث ِندامت ہونے چاہئیں جنہوں نے پاکستان کو پلیٹ میں رکھ کر امریکا کو پیش کیا۔ اس میں لیاقت علی خان، ایوب خان، اسکندر مرزا اور غلام محمد پیش پیش تھے 1974 میں تھرڈ ورلڈ فورم میں یہ بتایا گیا کہ کس طرح غیر ملکی سرمایہ کاری لوٹ کھسوٹ کا اہم ذریعہ تھا۔ پس ماندہ اور محکوم ملکوں کی صنعتی ترقی کو روک کر اُن کا خام مال پانی کے مول حاصل کرنا اور اپنی مصنوعات اور مشینری کو مہنگے دام فروخت کرنا جدید سامراجی لوٹ کھسوٹ کا سب سے اہم طریقہ کار ہے۔ غیر منصفانہ تجارت کی ابتدا عالمی بینک اور 'آئی ایم ایف' کی تشکیل کے بعد شروع ہوئی اور اس کی انتہا آزاد تجارت کے نام سے عالمی تنظیم کے ذریعے اس مقام تک پہنچا دیا کہ آج دنیا کے تمام ممالک قرضدار ہیں صرف بینک، مالیاتی ادارے اور ملٹی نیشنل کمپنیاں خوب فائدے میں ہیں۔ سابق سوویت یونین کے انہدام کے بعد دنیا کا غریب تو لاوارث ہوگیا نتیجتاً 1200 سرمایہ داروں کے پاس آدھی دنیا سے زیادہ کی دولت جمع ہوگئی ہے (آکسفام سروے) لیکن سرمایہ دار دنیا زائد پیداوار/زائد منافع خوری کی وجہ سے کساد بازاری کا شکار بھی ہے تیل پیدا کرنے والے ممالک کو جب عروج ملا جب پاکستان اور تیسری دنیا سے بے تحاشا محنت کش عرب ممالک جانے لگے جس کے نتیجے میں ترسیلات زر اقتصادی صورتحال کے لیے خوش آئند سمجھی گئی۔ اس میں بھی وہ لوگ جو پاکستان سے لانڈرنگ کرتے تھے وہ مافیا بھی گرم ہوئی اور انہوں نے پیسہ منگوانے کے لیے نئے ڈھنگ اپنائے جو اس وقت مقدموں کی صورت میں مختلف عدالتوں میں بے نقاب ہورہے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام سوویت یونین کے انہدام کے بعد مزید بے لگام ہوگیا نتیجتاً کیسنو میں جوئے کو اب سفید دھن کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر کسی ملک کا سرمایہ دار ایک ارب ڈالر ان کو دے تو ضابطے کے مطابق 10 فیصد کٹوتی کروائے، تو 90 کروڑ ڈالر ملیں گے وہ سفید ہوجائیں گے کیسنو لکھ کر دے گا کہ انہوں نے جوئے میں یہ رقم جیتی ہے اس کے علاوہ سٹہ بازی اسٹاک مارکیٹوں میں اندرونی کھیل نقد سود نے قرضوں اور کریڈٹ کارڈ کی صورت میں نچلے طبقوں کو اپنے شکنجے لے میں لیا ہے۔ بینک جو استحصال کی آماجگاہ ہے جس کے بارے میں امریکی صدر ابراہم لنکن نے کہا تھا کہ ان کے قرضے جاری رکھے گئے تو اگلی نسلیں اور آخر کے اثاثے گروی ہوں گے۔ اور آج 70 فیصد امریکی اثاثے گروی میں ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بینکوں کا سرمایہ حکومتی سرمایے کے ساتھ مل کر جب مالیاتی سرمائے کی شکل اختیار کر گیا تو تیسری دنیا میں سرمایہ کاری کر کے خوب منافع خوری کی اور قدرتی وسائل کی لوٹ مار بھی جاری رکھی۔ فوجی اسلحہ فروخت کر کے زرمبادلہ اور قرضوں کے بحران میں پھنسا دیا۔ پاکستانی حکمران ذاتی مفاد کی خاطر اس جال میں بخوشی پھنسے۔ چنانچہ پاکستان کو جس غرض سے سامراجی اپنے دائرۂ اثر میں رکھنے کی کوشش کررہے ہیں وہ ہے پاکستان کی جغرافیائی اہمیت۔ لیکن بنیادی وجہ کچھ بھی ہو، ایک مرتبہ جب کوئی ملک سامراجی نرغے میں پھنس جاتا ہے تو اس کا اقتصادی استحصال ہونا بھی ناگزیر ہوجاتا ہے۔

مذکورہ بالا مختصر تجزیے میں سیٹو سینٹو بڈ پیر میں امریکی اڈہ سوویت یونین

کے خلاف پاکستان کو فرنٹ لائن میں کھڑا کرنے کی تفصیل زیادہ طوالت چاہتی ہے۔اس لے اب یہاں سے موجودہ صورتحال کی طرف آتے ہیں۔گزشتہ 50 برسوں میں نواز شریف کی مسلم لیگ نے خاص طور پر زرداری کی پیپلز پارٹی کے 30 برس اور دس دس برس جنرل ضیأ اور جنرل پرویز مشرف کے شامل ہیں۔ان سب ادوار نے پاکستان کو معاشی طور پر مفلوج کر دیا۔جنرل ضیأ الحق نے امریکی جنگ میں حصہ لے کر کشمیر کے معاملات میں بعض تنظیموں کی تشکیل کی جو ملک کے فرقہ وارانہ تشدد اور بعض ازاں 9/11 کے بعد جنرل پرویز مشرف کے دور میں دہشت گردی کی جنگ کی صورت میں پاکستان کے معاشرے کو تتر بتر کر دیا۔کچھ لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ جنرل پرویز مشرف نے آئی ایم ایف کا کشکول توڑ دیا تھا۔یہ غلط فہمی اُن لوگوں کو لاحق ہوئی ہے جو عالمی معاشی نظام (سرمایہ داری) کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔شوکت عزیز نے 18۔ارب ڈالر کا بیرونی تجارت میں خسارہ چھوڑا اور خود اس کے بدلے (پیرٹی) میں 60 روپے فی ڈالر فکسڈ رکھا۔اس کی اجازت آئی ایم ایف نے اس لیے دی کہ بعد میں آنے والی حکومت آئی ایم ایف کے قدموں گرے۔چنانچہ زرداری حکومت نے ایسا ہی کیا۔قرض پر چلنے والے ممالک کرپشن بھی کریں‘ تو پھر وہ عوام کو ریلیف فراہم نہیں کر سکتے۔

پاکستان کے لبرل اور کچھ بائیں بازو کے لکھنے والے افراد اور تقاریر کرنے والے والوں کو یہ سوچنا ہوگا کہ پاکستان میں تماشائی اور ڈالر جمہوریت ہے اور جاگیرداری اور قبائلی نظام دیگر جہالتوں کے ساتھ مل کر مکمل طور پر طور پر عوام کا دماغ بند کرنے کے در پے ہے۔حالانکہ جب مغرب میں جمہوریت کی ابتدا ہوئی تو ساتھ ہی صنعتی انقلاب اور سوشلسٹ انقلاب دونوں کی تاریخ اجارہ داریوں کے خلاف جدوجہد اور جدل سے عبارت ہے۔یورپی جمہوریت کا ارتقاء شاہی حقوق کی اجارہ داریوں‘ جاگیرداروں کی اجارہ داریوں اور سرمایہ داروں کی اجارہ داریوں کے استبداد اور استحصال کے خلاف جدل اور جدوجہد سے ہوا۔جو آج کی جمہوریت میں ناپید ہے''کرونی کیپٹالزم'' کارپوریٹ کی کرنسی سے اپنے گھوڑے اور گدھے جمہوریت کے ایوانوں میں لے آئی ہے۔اب یہ ادارے سماجی تنظیم کے بغیر توڑے نہیں جا سکتے۔المیہ یہ ہے کہ سابق سوویت یونین کے انہدام سے سماجی و انقلابی تنظیم کی تشکیل انتہائی دشوار ہوگئی ہے اور نہ کوئی اتنا بڑا دانشور ہے جو سوشلزم کو سچو یشنل سائنس کے طور پر مارکسزم کی صورت کو آگے بڑھا کر دنیا کو بڑی تباہی سے بچائے۔اگر دنیا بھر کے ملٹری اخراجات اور عالمی غربت کا جائزہ لیا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سابق سوویت یونین کے انہدام کے بعد دنیا کا غریب لاوارث ہوگیا ہے۔یونیسف اور حقیقی دانشوروں کی رپورٹوں کا جائزہ لیں تو مختصراً یہ بات سامنے آتی ہے کہ دنیا کی 50 فیصد آبادی 2.50 ڈالر روزانہ کے تناسب سے اس آمدنی پر خاک بسر ہے اور بعض آبادیاں ایسی بھی ہیں جہاں قحط اور بھوک کا سونامی انسانیت سے انکار کرتا دکھائی دیتا ہے۔کیونکہ ابھی تک آدمی انسان نہیں بن سکتا۔روس کے عالمی سطح کے ناول نگار ٹالسٹائی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ''انسان کی ازلی خواہش ہے کہ وہ دوسرے انسان پر فتح پائے''۔خود اسلام میں یہ واضح طور پر بیان ہے کہ ھابیل اور قابیل کی آپس کی مڈ بھیڑ نے ایک قتل کر دیا۔بالالفاظ دیگر ہوس اور قتل عام مذہبی طور پر بھی آدمی کی سرشت بھی ہے۔اسی لیے تیسری دنیا کے 41 ممالک کا جی ڈی پی بڑے بینکوں اور ملکوں کا گروی ہے۔گھانا اور کئی دوسرے افریقی ممالک کا جی ڈی پی کا 100 فیصد سے دوسو فیصد قرضوں کے عوض گروی ہے۔پاکستان میں اس وقت یہ تناسب جی ڈی پی کا 79 فیصد ہے اور لبرل اور بعض بائیں بازو کے لوگ اُن جرائم پیشہ سیاستدانوں کی حمایت کرتے دکھائی دیتے ہیں جنہوں نے نچلی سطح تک جھوٹ اور کرپشن کو رائج کر دیا ہے اور سامراجی انڈسٹریلائزیشن کی عملی چوتھی جنریشن ناٹو کے ساتھ لوٹ مار کے ذریعے آزادی بھی چھین لی ہے۔ایک اندازے کے مطابق دنیا کے 56 کروڑ 70 لاکھ آبادی کی آمدنی سے کہیں زیادہ دنیا کے صرف سات مالدار ترین سرمایہ داروں کی آمدنی ہے‘ ہندوستان کے امرتا سین نوبل انعام یافتہ کا کہنا ہے کہ''ہندوستان کے چار سرمایہ داروں کی آمدنی 80 کروڑ آبادی سے زیادہ ہے۔پاکستان میں 50 فیصد دو نمبریوں کے پاس دولت ہے جن میں اب یہ خاندان 22 سے بڑھ کر ایک ہزار ہوگئے ہیں۔جن لوگوں نے سرمایہ دارانہ نظام کے تحت ترقی کی ہے انہوں نے دنیا کی لوٹ مار کر کے رقم صحت‘ تعلیم‘ سائنس اور ٹیکنالوجی پر لگائی۔تاہم عالمی ملٹری اخراجات کی حالت یہ ہے 2018 میں 1822 ارب ڈالر تک پہنچ گئے ہیں۔یہ اعداد و شمار اسٹاک ہوم

کے پیس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے دیئے ہیں۔ دنیا میں سب سے زیادہ اسلحہ پر اخراجات کرنے والے ممالک بالترتیب امریکا' چین' سعودی عرب' ہندوستان' اور فرانس قابلِ ذکر ہیں۔ ہندوستان 66.5 ارب ڈالر اور پاکستان گیارہ ارب ڈالر ملٹری اخراجات کرتا ہے۔ دنیا میں اسلحہ کی دوڑ کے ساتھ اگر پاکستان صرف پیدل چلتا ہے تو ترقی یافتہ دنیا شام بنا کر قبضہ کرنے کے درپے ہے۔ نام نہاد پاکستانی قوم پرستوں نے جو حشر اپنی عوام کا کیا ہے اس جانب کبھی کوئی بات نہیں کی جاتی۔ اب پس ماندہ قوم آزاد نہیں رہ سکتی یہ ترقی یافتہ عوام کی غلام بن کر اپنے قدرتی وسائل کو لٹتا دیکھ سکتی ہے۔ پاکستان میں 'بی بی سی' کی ہمہ گیر رپورٹ کے مطابق 2005۔ اور 2010 کے درمیان رکوڈیک سے ٹیتھین کاپر کمپنی نے 1500 میٹرک ٹن سونا اور تانبا نکالا ہے۔ لیکن پاکستان میں جو چند ایک سائنس دان سرکار کے پاس ہیں وہ سونے اور تانبے کا فرق نہیں سمجھ پائے۔ اِس تناظر میں شور و غل ہوا تو سابق چیف جسٹس افتخار احمد چوہدری نے بین الاقوامی معاہدات کے قوانین جانے بغیر کمپنی کو بند کرنے کا حکم دے دیا جس کی پاداش میں پاکستان پر چھ ارب ڈالر کا جرمانہ ہوا۔ لیکن ابھی تک پاکستان کے ان حکمرانوں کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا جو اس معاہدے کی ذمہ دار ہیں۔ کیا پاکستان کے نام نہاد دانشور نہیں جانتے کہ 70 سال میں پاکستان کے حکمران طبقے نے عوام کو جہالت کے اندھیروں میں ڈبو کر رکھا ہے۔ اسی لیے ایک اور چینی کمپنی ۵۲ من سونا غیر قانونی لے جانے کا مقدمہ پاکستان میں بھگت رہی ہے۔ پاکستانی سائنسدانوں کو ریت اور سونے کا فرق بھی معلوم نہیں' تو پھر وہ قومیں جو ترقی یافتہ ہیں وہ پس ماندگی کو ہمہ وقت روندنے کو تیار ہیں۔ یونیسف کے مطابق اس وقت بھی ایک ارب لوگوں نے بنیادی قاعدہ بھی نہیں پڑھا۔ 64 کروڑ دنیا کے لوگ صاف پانی کو ترستے ہیں۔ اس میں 40 کروڑ آبادی کو پانی ڈھونڈنا پڑتا ہے 27 کروڑ آبادی کو صحت کی سہولت تک یکسر رسائی نہیں' اور دوسری جانب ٹیکنالوجی کے نتیجے میں نامیاتی ذہن پیدا کر کے انسان کا پلازما خود بنا کر انسان بنانے کے خطرناک کام بھی جاری ہے۔ پاکستان میں ملٹری ٹیکنالوجی تو عالمی سطح کی ہے مگر سول ٹیکنالوجی کی یہ حالت ہے کہ 12 فلور میں آگ بجھانے کے لیے اسنارکل تک نہیں ہے۔ مزید براں 95 ارب ڈالر کے قرضے اور باہر کے ملکوں میں جمع اربوں ڈالر' بین الاقوامی تجارت میں 35 ڈالر کا خسارہ' کرنٹ اکاؤنٹ کا خسارہ 18 ارب ڈالر تقریباً دو درجن کے قریب بڑے سرکاری ادارے تباہ ہو چکے ہیں جن میں 'پی آئی اے' پاکستان اسٹیل ملز اور ریلوے قابلِ ذکر ہیں۔ دوسری طرف فورتھ ایج نالج اکانومی اور ٹیکنالوجی جہاں تک پہنچ چکی ہے وہاں مسئلہ یہ کھڑا ہو گیا ہے کہ تعلیم و تربیت کی رفتار سست ہونے کی وجہ سے ''اسکل گیپ'' رونما ہو گیا ہے۔ اور یہ عارضی بے روزگاری ہے۔ دوسری طرف مصنوعی ذہانت سے روبوٹس کے اجرا کے نتیجے میں 16 کروڑ خواتین کے بیروزگار ہونے کا خدشہ ہے۔

لیکن ترقی یافتہ قومیں ان کا نعم البدل بھی تیار کر رہی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں دنیا جس طرح تیز رفتاری سے آگے کی طرف دوڑ رہی ہے اور ہم چل بھی نہیں رہے ہیں یہ دنیا پس ماندگی کو مکمل طرح روند دے گی لیکن اس تیز رفتاری کو حادثہ پیش آ سکتا ہے جس میں نیوکلیئر کی ہولناکیاں' غیر منصفانہ دولت اور تعلیم کی تقسیم' آبادی کا دھماکہ خیز اور جہالت کا اندھیرا' یہ سب عوامل مل کر 21 ویں صدی کو انسانوں کے لیے آخری صدی ثابت کر سکتے ہیں۔ پاکستان کے بارے میں اس سارے تناظر میں کیا کہا جا سکتا ہے جہاں ملٹری اور سول ٹیکنالوجی میں زمین آسمان کا فرق ہے جہاں قبائلی اور جاگیرداری نظام کے علمبردار جمہوریت پسندوں اور بائیں بازو کی سوچ 1974ء سے آگے نہیں بڑھ پائی گلوبلائزیشن کے اندر سائنس اور ٹیکنالوجی کس طرف جا رہی ہے اور مارکسزم کو آگے نہیں بڑھایا اور قبائلی اور جاگیردارانہ نظام میں انقلاب لانے پر صرف مباحثہ ہی ہوتا ہے قربانیاں دینے والے دنیا سدھار گئے چند ایک رہ گئے ہیں وہ بھی اپنے مسائل جو موجودہ نظام نے مسلط کیے ہیں اُن سے پنجہ فگن ہیں یا پھر بیمار ہیں اور کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ سیاست میں ایک طرف نوٹ گنتی کرنے والے رہ گئے ہیں دوسری طرف کرکٹ کے ذریعے کرپشن کو بولڈ کرنے والے ہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ملک کو برباد کرنے والے جیل میں ہیں اور وہ سزا پائیں گے۔ پاکستان سی پیک کے لیے چین سے 60 ارب ڈالر کا قرضہ لے چکا ہے۔ لیکن اسٹیٹ بنک میں ایک ڈالر نہیں آیا اور ہم چین کو یہ قرضے ڈالروں میں واپس کریں گے۔ یہ الگ موضوع کہ اس سے کتنا فائدہ ہوگا؟ امریکا کے

مفادات بھی پاکستان کے ساتھ وابستہ ہیں' صرف فوجوں کا افغانستان سے نکلنے کا مسئلہ نہیں ہے' سی پیک میں حصہ داری کا مسئلہ بھی ہے۔ یہ سوالات بھی اہم ہیں کیا پاکستان دوبارہ بڑی طاقتوں کا فرنٹ مین بننے جا رہا ہے؟ کیا یہاں غربت ختم ہوگی۔ یہ دو اہم سوال ہیں جن کے جوابات پر غور وفکر کے ساتھ مباحثہ ہونا چاہیے ' کیونکہ دنیا میں ایک طرف سوشل سائنس دان ہیں اور دوسری طرف خالص سائنس دان ہے۔ پاکستان دونوں میں پس ماندہ ہے۔ سب سے بڑا سوشل سائنس دان کارل مارکس ہے اور اس کے علاوہ دنیا کے مصور' شاعر' ادیب اور فلسفی بھی ہیں سوشل سائنس ناپید ہوگئی تو دنیا تباہ ہو جائے گی۔ قارئین اور ساتھی ضرور غور کریں کہ محض عمران خان کے خلاف ہرزہ سرائی کا کوئی فائدہ نہیں نہ ہی ایک بڑے ٹولے کو اچھا کہنا اور دوسرے بڑے ٹولے کو نہایت بُرا کہنا بھی غلط ہے 70 سالہ تاریخ آپ کے سامنے ہے اور سابق سوویت یونین کے انہدام کے بعد جس کی لاٹھی اس کی بھینس اور ڈارون کا فلسفہ اس وقت چل رہا ہے۔ وقت کے ساتھ جو نہیں دوڑ پاتے' صرف چلتے ہیں' پہلے چلنے والے شکار ہوں گے اور دوڑنے والوں کو عالمی حادثہ پیش آئے گا اور قیامت سے پہلے قیامت کا نقشہ یقین میں بدل جائے گا۔ لیکن اس ابہام میں نہ پڑیں پاکستان کو نالج اکانومی کی دوڑ میں شامل رہنے کے لیے راستہ تلاش کرنا ہوگا۔

''ایک باعلم آدمی کو یہ علم ہونا چاہیے کہ وہ کتنا لاعلم ہے''

اس لیے میں جو کچھ لکھ رہا ہوں وہ حتمی نہیں' وہ رائے ہے' تجزیہ ہے جس میں غلطیاں بھی ہو سکتی ہیں اور کچھ نکات درست بھی ہو سکتے ہیں۔ البتہ یہ یاد رکھنا چاہیے اگر سرمائے کی تخلیق کا نظام انصاف پر مبنی نہ ہو تو جمہوریت' لبرل ازم' شہری آزادیاں اور انسانی حقوق بے معنی ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اس وقت دنیا سرمائے کے لحاظ سے (جس میں مالیاتی اور صنعتی سرمایہ دونوں شامل ہیں) دو واضح گروپوں میں بٹ گئی ہے ایک محدود اقلیت سرمایہ دار ممالک کی ہے جو سائنس' صنعت اور ٹیکنالوجی کی قوت سے مسلح ہیں اور دوسری بھاری اکثریت تیسری دنیا کے نادار ممالک کی ہے جو سائنس' صنعت اور ٹیکنالوجی میں انتہائی پس ماندہ ہے۔ اب سرمائے کی آزاد ٹریفک اور نج کاری کے مسلط کردہ عمل نے دنیا کی آبادیوں کے انبوہ کثیر کو جنگل کے بے رحم مقابلے کے حوالے کر دیا ہے جیسے روپے کو مارکیٹ کی بے رحم قوتوں کے آگے چھوڑ دیا گیا ہے مارکیٹ میں سرمایہ دار' سٹہ باز' کیسنو کے جواری' اسمگلر اور ذخیرہ اندوز بیٹھے کرنسی کا کھیل کھیلتے ہیں۔ عمران خان نے اتنا تو کیا ہے کہ ان کو دستاویزی معیشت میں لانے کے لیے زور لگایا ہے۔ اشرافیہ سے پنجہ فگن ہے لیکن عالمی نظام کے حواری اس کے اردگرد ہیں۔ لبرل والے اپنی اپنی تھیوریاں بیان کر رہے ہیں۔ وزیراعظم عمران خان اگر دستاویزی معیشت اور انکم ٹیکس وصول کرنے میں کامیاب ہو گئے تو بڑی کامیابی ہوگی لیکن اس کا انحصار فوج پر ہے جیسے ٹرمپ کا انحصار بھی 'سی آئی اے' وغیرہ پر ہے۔ لیکن وہ سامراج ہے اور ہم غلام ہیں۔ سوویت یونین کے انہدام کے بعد مذکورہ انبوہِ کثیر سے مقابلے کے لیے بین الاقوامی طور پر مشترکہ کاوشوں کا ہتھیار چھین لیا گیا ہے۔ پبلک سیکٹر کے ذریعے بنیادی صنعتوں کے حصول کا حق بھی چھین لیا گیا ہے۔ ہم مینوفیکچرنگ معاشرہ بنانے سے قاصر ہیں۔ ہم صرف سڑکیں اور اورنج لائن بنا سکتے ہیں قرضوں کے عاشق کرپشن اور اورنج لائن ہی بنا سکتے ہیں تعلیم اور صحت فروخت ہی کر سکتے ہیں۔ جناب عابد حسن منٹو اور اختر حسین کا زرعی اصلاحات کا مقدمہ کوئی سپریم کورٹ نہیں سُنے گی' ہم بکھرے ہوئے ہیں اور جہالت کے اندھیروں میں ڈوبے ہوئے قبروں پر چراغاں کرتے ہیں' پیروں کے پاؤں چومتے ہیں۔ پھولوں کو ان پر نچھاور کرتے ہیں۔ اور دوسری جانب کارپوریٹ سرمائے دار اور انفرادی سرمائے کے بے رحم مقابلے نے اجارہ داریوں کو ملٹی نیشنل' فارماسوٹیکلز کمپنیوں کا لائسنس مل گیا ہے۔ ہم کیوں اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہوئے یہ الگ داستان ہے۔ جس میں ہزاروں ترقی پسند دار و رسن کی نمائش سے گزرے' لیکن اُن کی کسی نے نہ سُنی۔ کون نہیں جانتا کہ اجارہ داریوں کا فروغ جمہوریت اور جمہور کے حقوق کا دشمن ہے۔

لیکن ہمارے یہاں بحث مریم سے شروع ہو کر عمران خان پر ختم ہو جاتی ہے۔ انقلابی تبدیلی کے لیے لوگوں کو شعور کون دے گا۔ اس کے لیے سیاسی تنظیم کون کھڑی کرے گا جو اصل کام ہے اِس طرف توجہ نہ ہونے کے برابر ہے۔

اقتصادی بحران اور غریب

ڈاکٹر توصیف احمد خان

تجارت کے موضوع پر شائع ہونے والے انگریزی کے اخبار میں شائع ہونے والے مضمون میں ملک کے موجودہ اقتصادی حالات کا آزادی کے فوراً بعد حالات کا تقابلی جائزہ لیتے ہوئے تحریر کیا گیا ہے کہ اس وقت ویسے ہی حالات ہیں جیسے کہ 1947ء میں تھے۔ ان حالات کی ذمہ داری تحریک انصاف کی حکومت پر عائد ہوتی ہے۔ وزیر اعظم عمران خان گذشتہ 12 برسوں کے دوران جن معاملات پر برسر اقتدار حکومتوں پر تنقید کرتے رہے ہیں انہوں نے ان ہی معاملات کو اپنی پالیسی کا حصہ بنالیا ہے۔ وزیر اعظم عمران خان گذشتہ 10 برسوں سے بار بار یہ اعلان کررہے تھے کہ ان کے ساتھ اسد عمر بہترین ماہر معاشیات ہیں اور وہ ان کی حکومت میں وزیر خزانہ ہوں گے، یوں اسد عمر نے خزانہ کی وزارت سنبھال لی مگر اسد عمر ملک کے اقتصادی ڈھانچہ اور اقتصادی مسائل کا ادراک نہیں کر پائے۔ عمران خان ہمیشہ سے عالمی مالیاتی اداروں ورلڈ بینک اور انٹرنیشنل مانیٹرنگ فنڈ (I.M.F) سے قرضے لینے کے خلاف تھے۔ انہوں نے عوام میں جھوٹی مقبولیت حاصل کرنے کے لیے ایک جلسہ میں یہ اعلان کیا تھا کہ ان اداروں سے قرضہ لینے کے بجائے خودکشی کرنا پسند کریں گے۔ اسد عمر نے اپنے قائد کے اس اعلان کو مدنظر رکھتے ہوئے فیصلہ کیا کہ آئی ایم ایف سے قرضہ نہیں لیا جائے گا۔ اس دوران خسارہ بڑھتا چلا گیا۔ تحریک انصاف کی حکومت نے اس خسارے کو پورا کرنے کے لیے چین اور سعودی عرب سے قرضہ حاصل کرنے کی حکمت عملی اختیار کی۔ ان ممالک نے زیادہ شرح سود پر ایک سال کے لیے قرضہ دیا۔ تحریک انصاف کی حکومت نے ان ممالک سے قرضہ لینے کا جشن منایا اور اپنی حکومت کی کامیابی قرار دیا۔ اسی وقت اقتصادی ماہرین نے واضح کیا تھا کہ حکومت کو مالیاتی خسارہ کو پورا کرنے کے ساتھ ان ممالک کا قرضہ اتارنے کے لیے اگلے سال آئی ایم ایف سے قرضہ لینا پڑے گا مگر ڈالر کی قیمت بے قابو ہونے اور اسٹاک ایکسچینج کرش ہونے کی بناء پر فوری طور پر آئی ایم ایف سے مذاکرات کا فیصلہ کیا۔ وزیر خزانہ اسد عمر واشنگٹن گئے اور آئی ایم ایف کی ٹیم سے مذاکرات کیے۔ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک امریکہ کی پالیسی کے تابع ہیں۔ امریکہ نے گذشتہ سال ہی یہ فیصلہ کیا تھا کہ پاکستان کو آئی ایم ایف سے حاصل ہونے والا قرضہ چین کا قرضہ اتارنے کے لیے استعمال نہیں ہونے دیا جائے گا، یوں اسد عمر واشنگٹن سے خالی ہاتھ واپس آئے۔ آئی ایم ایف کے ماہرین کے سخت رویہ کی بناء پر وزیر اعظم عمران خان نے اپنے ساتھی اسد عمر کو سبکدوش کیا اور آئی ایم ایف سے قربت رکھنے والے ڈاکٹر حفیظ شیخ کو خزانہ کا انچارج بنایا۔ پھر آئی ایم ایف مصر کے ڈائریکٹر باقر رضا کو اسٹیٹ بینک کا صدر مقرر کیا گیا۔ معروف چارٹرا کاؤنٹنٹ شبر زیدی کو ایف بی آر کا چیئر مین بنایا گیا۔ حکومت نے آئی ایم ایف کی بدترین شرائط کو مان لیا اور بجٹ سے پہلے ہی بجلی، گیس اور پیٹرول کی قیمتیں بڑھادی گئیں۔ پھر تاریخ کا بدترین بجٹ پیش کیا گیا۔ اس بجٹ میں عام آدمی کی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے مراعات نہیں دی گئی بلکہ ضروریات زندگی پر ٹیکس لگادیئے گئے۔ وفاقی حکومت نے تعلیم اور صحت کے بجٹ میں کمی کردی۔ سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں اضافہ کیا گیا مگر انکم ٹیکس کی شرح بڑھادی گئی۔ عام مزدور کی تنخواہ 17500 روپے مقرر کی گئی مگر وفاقی حکومت نے دو بچوں پر مشتمل ایک چھوٹے خاندان کا بجٹ اس کم تنخواہ میں چلانے کے معاملے کو فراموش کردیا۔ پھر حکومت نے کم سے کم تنخواہ کے اپنے اعلان پر عملدرآمد کے لیے کسی طریقہ کار کا اعلان نہیں کیا۔ ملک میں حکومت کے مزدوروں کی کم از کم تنخواہ کے قانون پر عملدرآمد نہیں ہوتا، حتیٰ کہ وفاقی حکومت اور اس کے زیر انتظام خودمختار اور نیم خودمختار اداروں میں بھی وفاقی حکومت کے اس اعلان سے کم اجرت دی جاتی ہے۔ اب بھی وفاقی حکومت اور اس کے خودمختار اور نیم خودمختار اداروں میں ہزاروں مزدور برسوں سے ڈیلی ویجز پر کام کرتے ہیں۔ حکومت کے قوانین کے تحت تین ماہ مسلسل ملازمت کے بعد مستقل ہونا مزدوروں کا حق ہے مگر وفاقی حکومت ان ملازمتین کو مستقل نہیں کرتی۔ اس

بجٹ میں اس اہم مسئلہ پر خاموشی اختیار کیے رکھی۔ پھر حکومت نے سرکاری ملازمین کی پنشن میں 10 فیصد اضافے کا اعلان کیا مگر اولڈ ایج بینیفٹ انسٹی ٹیوٹ (E.O.B.I) میں رجسٹرڈ مزدوروں کی پنشن میں اضافہ کا کوئی اعلان نہیں کیا۔ ان مزدوروں کو ماہانہ 6 ہزار 5 سو پنشن ملتی ہے۔ مصارف زندگی بڑھنے سے مزدوروں کے لیے زندگی گزارنا مشکل ہو چلا ہے۔ ای او بی آئی کے مزدور کئی برسوں سے مطالبہ کررہے ہیں کہ یہ پنشن مزدور کی کم از کم اجرات کے برابر کی جائے۔ جس طرح سرکاری ملازمین کی پنشن میں اضافہ کیا جاتا ہے ویسے ہی اضافہ ان کے لیے بھی کیا جائے مگر وفاقی حکومت اس مطالبہ پر کان دھرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ پھر حکومت نے مقامی صنعتوں کی برآمدات پر زیرو ریٹنگ ختم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس فیصلے کی بناء پر برآمدات پر لگنے والے ٹیکس کی بناء پر برآمد کی جانے والی اشیاء پر آنے والی لاگت بڑھ گئی جس کے نتیجے میں بین الاقوامی مارکیٹ میں ان اشیاء کا دوسرے ممالک کی اشیاء سے مقابلہ مشکل ہوگیا۔ کراچی، لاہور اور فیصل آباد کی ٹیکسٹائل اور دیگر صنعتوں کے مالکان نے واضح کیا کہ زیرو ریٹنگ کی رعایت ختم ہونے سے ان کی تیار کردہ اشیاء کی برآمدات متاثر ہوں گی اس بناء پر ان مالکان کے لیے کارخانہ بند کرنے کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہوگا۔ محتاط اندازے کے مطابق مقامی صنعتوں کی بندش سے لاکھوں مزدور بے روزگار ہوجائیں گے۔ ملک میں صنعتی ترقی نہ ہونے سے روزگار کے مواقع کم ہوگئے ہیں۔ اس وقت پڑھے لکھے اور اعلیٰ تربیت یافتہ نوجوانوں میں بے روزگاری کی شرح خطرناک حد تک بڑھی ہوئی ہے۔ طبی شعبہ کے علاوہ انجینئر نگ، بینکنگ اور ہیومن ریسورس کے شعبوں میں اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں بے روزگاری کی شرح بہت زیادہ ہے۔ نیب، اسٹیٹ بینک اور ایف آئی اے کی سرگرمیوں کی بناء پر اقتصادی شعبہ فعال نہیں ہوسکا ہے۔ بجٹ میں اقتصادی شعبہ کو فعال کرنے کے لیے اس معاملہ پر کوئی توجہ نہیں دی گئی ہے۔ اقتصادی شعبہ فعال نہ ہونے کی بناء پر روزگار کے لیے مواقع نہیں ابھر رہے۔ پہلے انجینئر نگ اور ایم بی اے کی ڈگری حاصل کرنے والے نوجوانوں کے لیے سعودی عرب، کویت اور خلیجی ممالک میں روزگار کے اچھے مواقع میسر ہوتے تھے مگر گزشتہ چند برسوں سے سعودی عرب اور خلیجی ممالک کی معیشت اتار چڑھاؤ کا شکار رہی ہے۔

سعودی عرب نے اپنے شہریوں کو ملازمتیں دینے کو ترجیح دی ہے اور پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش سے آنے والے لاکھوں افراد اپنے اپنے وطن جانے پر مجبور ہورہے ہیں۔ ایسی ہی صورتحال خلیجی ممالک کی ہے جہاں غیر مقامی افراد کے لیے روزگار اور کاروبار کے مواقع کم ہورہے ہیں مگر وفاقی بجٹ میں ان نوجوانوں کی مستقل بنیاد پر ملازمین دینے کے مسئلے کو وفاقی بجٹ میں شامل نہیں کیا گیا۔ پھر تعلیم کے بجٹ میں کمی سے ہائر ایجوکیشن کمیشن بحران کا شکار ہے۔ ایچ ای سی نے یونیورسٹیوں کو فراہم کی جانے والی گرانٹ میں کمی کردی ہے۔ صوبوں نے جونئی یونیورسٹاں قائم کی ہیں ہائر ایجوکیشن کمیشن اپنی گرانٹ انہیں دینے کو تیار نہیں۔ یوں یہ نئی قائم ہونے والی یونیورسٹیاں اپنے انفرااسٹرکچر تعمیر نہ کرسکیں گی اور قابل اساتذہ کی بھرتیوں کے امکانات کم ہوجائیں گے۔ اس وقت ملک میں 10 ملین کے قریب بچے اسکول نہیں جاتے۔ ناخواندگی اقتصادی ترقی کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ ان 10 ملین کے قریب بچوں میں بچیوں کی اکثریت ہے۔ اگرچہ تعلیم بنیادی طور پر صوبوں کا معاملہ ہے مگر 6 سے 15 سال کی عمر کے بچوں کو اسکولوں میں داخلہ دلانے کے لے خطیر رقم کی ضرورت ہے مگر وفاقی بجٹ میں ان ناخواندہ بچوں کے اسکولوں میں داخلے کے لیے کوئی اسکیم نظر نہیں آتی۔ یہی صورتحال صحت کے بجٹ کی ہے۔ حکومت نے صحت کے بجٹ میں کمی کردی ہے۔ جس سے غریب مزدور براہ راست متاثر ہونگے۔ اگر صرف اسلام آباد کے ہسپتالوں کا جائزہ لیا جائے تو ایک ایک بیڈ پر کئی مریض آرام کرتے نظر آتے ہیں۔ اسلام آباد کے علاوہ یہاں مریض راولپنڈی اور گجرات کے علاوہ کشمیر، گلگت، بلتستان سے آتے ہیں۔ حکومت نئے ہسپتال قائم کرنے سے قاصر ہے۔ سرکاری ہسپتالوں میں اب بھی مریضوں کو ادویات اور آپریشن کا سامان باہر سے خرید کر لانا پڑتا ہے اور اس مریض کے خون کے ٹیسٹ اور ایکسرے وغیرہ بھی باہر سے کرائے جاتے ہیں۔ وفاقی حکومت نے کراچی کے تین بڑے ہسپتالوں کا نظام بھی سنبھال لیا ہے۔ سندھ حکومت نے ان ہسپتالوں میں انفرااسٹرکچر کی ترقی پر خاطر خواہ رقم خرچ کی تھی۔ ان ہسپتالوں میں بڑے آپریشن بھی مفت میں ہوتے ہیں۔ حکومت نے صحت کے بجٹ میں کمی کردی ہے، یوں سرکاری ہسپتالوں کے حالات مزید خراب ہوجائیں گے۔

(باقی صفحہ 34 پر ملاحظہ فرمائیں)

عوامی لائن (Mass line) تھیوری

صباح الدین صبؔا

یہ بات درست ہے کہ مارکس تعلیمات میں انقلاب کے کسی ایک یا دوسرے طریقے کی کوئی پابندی نہیں بلکہ انقلاب کی حکمت عملی وقت اور مقام کے لحاظ سے جدوجہد وجہد عملی جدوجہد سے وضع ہوتی ہے۔ تاہم انڈونیشیا، چلی اور حال ہی میں لاطینی امریکی ممالک میں انقلاب کی تعمیر میں درپیش رکاوٹیں اور سازشیں بتا رہی ہیں۔ آج بھی سماجی اقتصادی تبدیلی کی راہ پرامن اور جمہوری نہیں اور صرف انقلاب ہی عوام کی تقدیر بدل سکتا ہے۔ بہرحال بدلتے ہوئے وقت اور حالات نے واضح کیا ہے کہ جدوجہد کی ہر شکل قانونی وغیر قانونی، جمہوری اور تشدد نہ صرف جائز ہے بلکہ انقلابی کارکنوں کو ان سب مراحل میں جدوجہد کو آگے بڑھانے میں مہارت حاصل کرنی چاہیے۔

عوامی لائن یا Mass line بنیادی مارکسی لیننی اصول ہے جو عوامی تناظر میں ہمارے عوامی کام کی رہنمائی کرتی ہے۔ عوامی لائن کا بنیادی سبق یہ ہے کہ یہ ہمیں اپنے عوام پر مکمل اعتماد اور انحصار ہونا چاہیے یہ اس بات پر زور دیتی ہے کہ انقلاب کا انحصار لازمی طور پر عوام کی وسیع اکثریت پر ہونا چاہیے اور اکثریت کو لازماً متحرک کیا جانا چاہیے۔

پارٹی کے لئے اس بات کو ہر صورت یقینی بنانا ضروری ہے کہ کوئی بھی ساتھی خواہ کسی بھی پوزیشن پر ہو عوام سے براہ راست رابطے میں رہے اور ان کے ساتھ برابری کی بنیاد پر رشتہ استوار کرے اور کسی صورت میں ان پر برتری جتانے کی کوشش نہ کرے۔

پاکستان میں بائیں بازو کے حلقے میں ایک نئی تازگی کے ساتھ ہی یہ بحث عام ہے کہ بائیں بازو کی پارٹی آج کے دور میں کیسی ہونی چاہیے۔ جدوجہد کی شکل کیا ہو انقلاب کی نوعیت کیا ہوگی۔ مارکسی تعلیمات کی روشنی میں ان سوالوں کا جواب محض نظری بحث وتمحیص کے حاصل نہیں کیا جاسکتا اس کیلئے عمل (Practice) سے رجوع کیا جانا ضروری ہے۔ لہذا پاکستانی بائیں بازو کی تنظیم کیلئے مصروف عوامی لائن نظریے کو اختیار کیا جانا چاہیے۔

عوامی تناظر (Mass perspective) ایک نقطہ نظر ہے جس کے مطابق 1۔ عوام تاریخ کے خالق ہیں اور انقلاب صرف عوام ہی لا سکتے ہیں۔

2۔ عوام کیلئے اپنے تجربے اور جدوجہد سے خود یہ سمجھنا لازم ہے کہ انقلاب ضروری ہے۔

3۔ انقلابی پارٹی کے کارکنوں کی عوام کی مختلف تحریکوں میں شمولیت لازم ہے۔ انہیں ان تحریکوں میں اس طرح عوام کی قیادت کرنی چاہیے کہ عوام انقلاب سے قریب ہوں۔

جدید چین کے بانی اور بین الاقوامی پرولتاریہ کے عظیم رہنما اور استاد ماؤ زے ڈونگ نے درست طور پر نشاندہی کی ہے

Where do correct ideas come from ? Do they drop from skies?No. Are they innate in the mind?No. They come from social practice and from it alone, they come fr om three kinds of social practice, The struggle for production , The class struggle and societific experiment . It mans social bieng that determines his thinking.

مارکس کا کہنا ہے کہ چونکہ تھیوری کا ذریعہ عمل ہے۔ اگر ہمیں ایک درست انقلابی تھیوری کی تلاش ہے تو یہ ہمیں صرف انقلابی عمل میں ملے گی اور چونکہ انقلاب برپا کرنے کی اہلیت صرف عوام میں ہے۔ لہذا ہمیں عوام کے انقلابی عمل سے مربوط ہونا پڑے گا۔

عوامی ورکرز پارٹی کی دوسری کانگریس منعقدہ کراچی میں سماجی تبدیلی

اور اور انقلابی پارٹی کی تعمیر کو مقصد قرار دیا گیا۔ پارٹی بنانے کے عمل میں عوامی کام کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ عوامی کام اور انقلابی عوامی تحریک عوام میں پارٹی کی توسیع تنظیم کے لئے موزوں ماحول پیدا کرتی ہے۔

ہمارے عہد کی ایک بڑی اور فعال انقلابی تنظیم کمیونسٹ پارٹی آف فلپائن کا کہنا ہے

Mass work and revolutionary mass movement establishes the conditions for broadening and strengthening the party among the masses.

عوامی لائن یا ماس لائن تھوری مارکس نظریہ علم کے مطابق تین مراحل پر مشتمل ہے۔

1۔عوام کے مشترکہ خیالات کو اکٹھا کرنا۔

2۔ان خیالات کو عوام کے دیرپا مفادہ ہمیں انقلابی نظریئے کی روشنی میں اور معروضی حقائق کے سائنسی تجزیے کے مطابق منظم اور واضح کرنا۔

3۔ ان مربوط خیالات کو عوام میں سیاسی لائن کی صورت میں واپس لے جانا جس سے عوامی جدوجہد کو انقلاب سے قریب تر کرنے میں مدد ملتی ہے۔

ہمیں یقین ہے اور یہ یقین تجربے اور مشاہدے کی بنا پر ہے کہ عوام ہی تاریخ کے خالق ہیں اور عوام ہی ہمارے اصل استاد ہیں۔ ہمیں اپنی غلطیوں کی اصلاح اور نقطہ نظر کی وضاحت حاصل کرنے کیلئے عوام سے بار بار رجوع کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ ہم اگر لوگوں کو ان کی خواہشات کے برعکس کام کرنے کا کہیں گے تو یقینی طور پر عوام سے کٹ جائیں گے۔ اور اگر ہم اس وقت جب عوام آگے بڑھنے کو تیار ہیں۔ ان کی رہنمائی سے گریز کریں گے تو ایسی صورت میں بھی ہم عوام سے دور ہو جائیں گے۔

عوامی کام کے دوران تحکمانہ رویے (Commandism) اور دُم چھلا پن (Tailism) دونوں رویے نقصان دہ ہوتے ہیں۔

پاکستان کے بائیں بازو میں سب سے اہم اور نمایاں کمزوری عوام سے رابطہ کی کمی اور نظری علوم پر مکمل انحصار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بائیں بازو کے اکثر ساتھی عوام کے مزاج، ثقافت اور امنگوں سے مکمل واقفیت نہیں کر پاتے اور عوام کو تخلیقی انداز میں قیادت فراہم نہیں کر پاتے۔

طبقاتی لائن واضح نہ ہونے کے باعث سرگرم کارکنوں میں سے اکثریت کا تعلق پیٹی بورژوا طبقات سے ہوتا ہے اور وہ اپنے پیٹی بورژوا خیالات اور رجحانات کا مظاہرہ عوام میں کرتے ہیں۔ مثلاً اعلیٰ متوسط طبقے میں مرد اور عورت ایک دوسرے کے ساتھ نسبتاً آزادروی کے ساتھ ملتے جلتے ہیں۔ جب یہی مظاہرہ وہ غریب عوام کے سامنے کرتے ہیں تو عوام اسے پسند نہیں کرتے۔

عوامی کام کرنے اور اس کے نتائج حاصل کرنے کیلئے ضروری ہے کہ عوام کی خواہشات اور امنگوں کا پورا احترام کیا جائے۔

لہذا پاکستان میں بائیں بازو کی تنظیم کاری اور اس سے جڑے مسائل کو سمجھنے اور اس کا حل تلاش کرنے کیلئے عوامی لائن (Mass line theory) پر پوری طرح سے عملدرآمد کرنا انتہائی ضروری ہے۔

نور الہدیٰ شاہ

دل چاہتا ہے

غار اصحاب کہف میں جا کر سو جاؤں
جب نیند سے اٹھوں
میرا زمانہ گزر چکا ہو
میرے سکے کھوٹے ہو چکے ہوں
میری بات کوئی نہ سمجھتا ہو
مجھے کوئی نہ جانتا ہو
رب سے پوچھوں
بتا کہاں جاؤں
رب کہے تیرے زمانے اب نہیں رہے
انسان سبھی مر چکے
صرف ہجوم زندہ ہے
جنون زندہ ہے
تو لوٹ جا
غار اصحاب کہف میں پھر سے سو جا

نیولبرل ازم اور بائیں بازو کی سیاست

خرّم نیر

یہ ذکر ہے اس زمانہ کا جب میں نے میٹرک پاس کر لیا تھا اور کالج ابھی شروع نہ ہوا تھا جبکہ ریاستی دعوؤں کے مطابق ایم کیو ایم کا قریب قریب صفایا ہو چکا تھا۔ میں اس شام ہوٹل پر ادھار کی چائے کے ساتھ دوستوں سے اس موضوع پر بحث کر رہا تھا کہ ایم کیو ایم کے زوال سے پیدا ہونے والی خلا کہیں مذہب کے ٹھیکیدار نہ ہڑپ کر جائیں۔ ایسے میں اچانک کہیں سے آواز آئی کہ امریکہ پر مجاہدوں نے حملہ کر دیا ہے۔

ہماری نسل اس زمانہ میں سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ امریکہ جیسی سپر پاور پر بھی کوئی حملہ کر سکتا ہے۔ جلدی جلدی گھر پہنچا اور ٹی وی پر دو جہازوں کو ورلڈ ٹریڈ سینٹر سے ٹکراتا دیکھ کر حیرت میں ڈوب گیا۔ مجھے یاد ہے کہ سوا سونے کے میں دو دن تک مسلسل یا تو اخبار پڑھتا رہا یا ایس ٹی این پر سی این این اور پی ٹی وی پر خبریں دیکھتا رہا۔ جس تیزی سے واقعات رونما ہو رہے تھے اور جس اجلت کے ساتھ بش پیش قدمی کر رہا تھا لگ رہا تھا ایک آدھ سال میں ہی دہشت گردی کا خاتمہ ہو جائے گا۔

جب امریکہ نے افغانستان پر حملہ کیا تو زیادہ تر لبرل خوشی سے جھوم اٹھے کہ اب مذہبی سیاست کا اختتام قریب ہے۔ جس انداز میں دنیا کا بیانیہ ترتیب دیا جا رہا تھا میں بھی اس میں بہہ رہا تھا اور یہ دیکھنے سے قاصر تھا کہ اسامہ بن لادن کے نام پر افغانستان کو کس خون اور آگ کی ہولی کی نظر کیا جا رہا ہے۔ اگلے چند سال دیگر کئی لبرلز کی طرح مشرف کے روشن خیال معتدل اسلام اور امریکہ کی دہشت گردی کے خلاف جنگ کے بیانیہ میں پھنس کے گزارے مگر کالج ختم ہو گیا یونیوسٹی بھی ختم ہو گئی نہ جنگ ختم ہوئی نہ فوجی آپریشن ختم ہوئے اور نہ ہی دھماکے۔

یہ سمجھنے میں بڑا عرصہ لگا گیا کہ امریکہ جیسی نیولبرل ریاستیں کس انداز میں کام کرتی ہیں۔ نیولبرل ریاستیں سیاسی وسماجی جھٹکوں اور بحرانوں کی تاک میں رہتی ہیں اور نہ ملے تو خود پیدا کر لیتی ہیں۔ جس آسانی سے امریکہ نے افغانستان اور پھر عراق پر چڑھائی کی وہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر ہونے والے حملے کے بغیر ممکن نہ تھی اور آج پورے مشرق وسطیٰ پر من مانی کرنے کا جواز اس کے پاس ہے۔ اس ہی طرح امریکہ ہی نہیں دنیا بھر کی حکومتیں دہشت گردی کے نام پر با آسانی منافع خوری پر مبنی عوام دشمن پالسیاں متعارف کراتی چلی گئیں۔ زیادہ دور نہ جائیں پاکستان کو ہی لے لیں تو مشرف اور اس کے ادارے نے نہ صرف اس کے ذریعہ بے تحاشہ ڈالر کمائے بلکہ اپنی غیر آئینی حکومت کو بھی دوام بخشا۔

اس کے ساتھ ساتھ عوام پر جبر کرنے کے لئے کتنے ہی کالے قوانین کو جواز فراہم کیا گیا اور ماورائے عدالت ظلم وستم کی داستانوں کو دوام بخشا گیا۔ 90 دن کے سیاہ قانون سے لے کر جبری گمشدگیوں تک ہر ظلم کی بنیاد دہشتگردی کے خلاف جنگ کے نام پر رکھی گئی۔ امریکہ ہو یا پاکستان ہر سرمایہ دارانہ ریاست نے نہ صرف اس جنگ سے استفادہ حاصل کیا بلکہ آج بھی ان کی خواہش اور کاوش یہی ہے کہ یہ جنگ جاری وساری رہے اور عوام اپنے حقوق سے ماورا یا تو جہاد کے نام پر دہشگردی کے پیچھے کھڑی رہے یا دہشتگردی کے خلاف جنگ میں کھوئی رہے۔

آرمی پبلک اسکول پر حملہ کے بعد جس خوبصورتی سے لال مسجد کے باہر سول سوسائٹی کا ڈرامہ لگایا گیا اس کو تو ماننا پڑے گا اور پھر اس کی آڑ میں جس انداز کے قوانین بنائے گئے اور جبر مسلسل عوام اور خاص کر سیاسی کارکنان پر نازل کیا گیا وہ تو آپ کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ مگر اس میں قصور صرف مذہبی جنونیوں کا نہیں نیولبرلزم کے اس کھیل بائیں بازو کے وہ غدار بھی شامل ہیں جو آج کل سول سوسائٹی اور این جی اوز کے چوہدری بنے بیٹھے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو پاکستان سے باہر بیٹھ کر ڈونر ایجنسیاں این جی اوز اور تھنک ٹینک چلاتے ہیں اور دہشت گردی اور مذہبی انتہا پسندی کے نام پر مال بھی بنا رہے ہیں اور نام بھی۔

مذہب کے ٹھیکیداروں کا تو سمجھ میں آتا ہے مگر یہ سول سوسائٹی اور این جی او کے ٹھیکیدار بھی مذہب کو کسی نہ کسی طرح ہر مدعہ میں شامل کر لیتے ہیں۔ کوئی ان سے پوچھے کہ صاحب کیا ہوا مولوی عبدلعزیز کا؟ مولوی عبدلعزیز تو دوبارہ ریاست کا لاڈلہ بن گیا مگر اس کے خلاف چلنے والی تحریک ایک این جی او میں تبدیل ہوگئی۔ پھر خیر پور دھماکہ کے بعد کراچی کے دھرنے میں ایک طرف بائیں بازو کے نمائندوں کو فوج پر تنقید کرنے سے روکا جا رہا تھا تو دوسری جانب سول

سوسائٹی کے نمائندوں کو ہیرو بنانے کے لئے امریکہ سے پرانے کامریڈوں کی کالز آ رہی تھیں کہ ان کے لاڈلوں کی موقع پرستی کو نشانہ نہ بنایا جائے۔ جب آپ ایک انسان کو ہیرو بنا کر ہر چیز اس کے ہاتھ میں پکڑا دی اور وہ جان بوجھ کر مذاکراتی میز پر بازی ہار کر آ گیا مگر آپ کی ذات پر کیا فرق پڑتا ہے۔ خرم زکی ہی تو شہید ہوا نا اور اس کو بھی آپ نے بولا تھا کہ اس بار " آئی ایس آئی " نے لال مسجد کے باہر دھرنا دینے سے منع کیا ہے۔

بلاگرز کی جبری گمشدگی کے دوران کون لوگ تھے جو نہ صرف یہ چاہتے تھے کہ ان چار بلاگرز کے نتیجہ میں اٹھنے والی تحریک کا حصہ تمام گمشدہ افراد نہ بن سکیں؟ کون تھے جو بلاسفیمی کے پروپیگنڈے کا جواب دینے میں زیادہ مصروف تھے؟ جس وقت ضرورت اس بات کی تھی کہ بیانیہ کو گمشدہ افراد کے مسئلہ پر مرکوز رکھا جائے یہ لوگ بحث کو اس جانب لے گئے جہاں ریاست اسے لے جانا چاہتی تھی۔ سونے پر سہاگا کسی مولوی کو بٹھا کر پریس کانفرنس کر کے یہ ثابت کرنے بیٹھ گئے کہ یہ بلاگرز پکے مسلمان تھے۔ کیا آپ نہیں جانتے تھے کہ اگر آپ کے پاس ایک مولوی ہے تو ان کے پاس ایک ہزار ہیں یا آپ کو بھی مذہب کی ضرورت تھی کیونکہ اس ہی سے آپ کا کاروبار بھی وابستہ ہے اور نام و نمود بھی۔

امریکہ ہو یا پاکستان ہر ریاست دونوں طرف کھیل رہی ہے۔ ایک طرف مذہبی انتہاپسندی اور دہشت گردی کو بھی زندہ رکھا ہوا ہے اور دوسری جانب دہشت گردی کے خلاف جنگ بھی جاری رکھی ہوئی ہے۔ ایک طرف کے نوجوانوں کو مذہب کے بیوپاریوں کے حوالے کر دیا ہے اور دوسری جانب کے نوجوانوں کا غم وغصہ پورا کرنے کے لئے این جی او اور سول سوسائٹی کا دھندا چالو رکھا ہوا ہے۔ پھر نوجوانوں کے بڑے جتھے کو کرپشن کے بیانیہ میں الجھا رکھا ہے جیسے کرپشن اس نظام کا اپنا حصہ نہیں اور اگر یہ نہ ہوتی تو سرمایہ دارانہ نظام میں دودھ کی نہریں بہہ رہی ہوتیں۔

ان حقیقی یا مصنوعی بحرانوں اور ایسے کئی اور بحرانوں کو استعمال کرتے ہوئے نیولبرلزم تیزی سے معاشرے کے ہر حصہ کو متاثر کر رہا ہے۔ صحت ہو یا تعلیم ہر بنیادی ضرورت کو کاروباری طبقہ کے حوالے کر دیا گیا ہے اور ریاست [illegible] داروں کو تحفظ اور استحصال کرنے کے لئے ان کے من مانے حالات فراہم کرنے کا ادارہ بن کر رہ گئی ہے۔ پاکستان ہی نہیں دیگر ممالک کے تعلیمی اداروں کو سرمایہ داروں کے ٹریننگ سینٹرز میں تبدیل کر دیا گیا ہے اور نوجوانوں میں تنقیدی فکر اور سماجی شعور ناپید ہوتا جا رہا ہے جبکہ انفرادیت اور مقابلہ بازی فروغ پا رہی ہے۔ بنگلہ دیش چھہاترا لیگ جس نے عوامی لیگ جیسی قد آور سیاسی تنظیم اور کئی دانشوروں کو جنم دیا تھا آج حکومت اور یونیورسٹی انتظامیہ کے غنڈوں کا کام سر انجام دے رہی ہے۔

سیاست بھی یوں تو بہت پہلے سے بیوپار بن گئی تھی مگر اب تو حد یہ ہے کہ ایک ہی ایجنسی مخالف تنظیموں کی کیمپین ڈیزائن کر کے پیسہ اینٹھ رہی ہے اور ایک ہی گلوکار کئی تنظیموں کے ترانے گاتا دکھائی دیتا ہے۔ نظریات کی جگہ چھوٹے مسائل کی سیاست کو پروان چڑھایا جا رہا ہے اور طلبہ یونین، مزدور یونین اور دیگر جمہوری ادارے جن سے ایک عام آدمی کا سیاست اور فیصلہ سازی کا رشتہ قائم ہوتا تھا اسے فارغ کرنے کے اس کے لئے این جی او اور سول سوسائٹی کے پلیٹ فارم بنا دئے گئے ہیں جو خود ایک کارپوریشن کی طرح چل رہے ہیں۔ ڈیولپمنٹ اور سوشل ورک میں ڈگریاں جاری ہو رہی ہیں اور لوگ باقائدہ اس کو ایک کرئیر کی طرح اپنا رہے ہیں۔

دوسری جانب جب بھی سیاسی پارٹیاں اور ریاستی ادارے بے نقاب ہونے لگتے ہیں اور لوگوں کا ریاستی نظام پر سے اعتماد اٹھنے لگتا ہے اس بیانیہ کے ساتھ نئے کھلاڑی اتار دئے جاتے ہیں کہ نظام کے اندر رہتے ہوئے تبدیلی ممکن ہے جیسے تبدیلی کسی شخصیت سے جڑی ہوئی ہے کہ اچانک عمران خان وارد ہوا تو علیم خان جہانگیر ترین شاہ محمود قریشی اور صدیوں سے راج کرنے والے لوٹوں کی ٹیم کے باوجود پاکستان یکا یک پیرس بن جائے گا۔ یہ تو خیر کوئی پوچھنا گوارا ہی نہیں کرتا کہ کیسے؟ کیوں کیسے کب کہاں یہ تو ہمارا تعلیمی نظام پوچھنا سکھاتا ہی نہیں۔ جو وہ ہمیں سکھاتا ہے وہ یہ کہ اس آزاد دنیا میں ایک شخص سب کچھ کر سکتا ہے۔

دوسری جانب اگر لوگ ایسے کسی مسیحا سے بھی متاثر نہ ہوں تو کہا جاتا ہے کہ ان میں سے جو کم برا ہو اس کو ووٹ دے دو کیونکہ ووٹ میں بڑی طاقت ہے۔

ایک عام آدمی کی جمہوریت بس یہی رہ گئی ہے کہ ہر پانچ سال بعد جا کر ووٹ دے اور امید کرے کہ شاید آمدنی خرچوں سے نمٹنے کے قابل ہو جائے۔ ساتھ ہی ساتھ [illegible] لوگ اشرافیہ کے اس نام نہاد جمہوری نظام سے امید وابستہ رکھے رہیں گے اور انفرادیت سول سوسائٹی ایکٹوزم اور این جی اوز اور بحرانوں کی سیاست کے جنگل میں پھنسے رہیں گے نظام کی تبدیلی تو کجا عوامی سیاست کا جنم لینا بھی مشکل رہے گا۔ (باقی صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

قومی سوال کا تاریخی تناظر

محمد سعید (نواں لاہور)

نوٹ: مضمون کا پہلا حصہ پچھلے شمارے میں شائع ہوا تھا۔

ماضی میں پاکستان میں بائیں بازو کی سیاست دو موضوعات کا احاطہ کرتی تھی۔

قومی جمہوری انقلاب اور عوامی جمہوری انقلاب

یہ کوئی لفظوں کی جنگ نہ تھی بلکہ اس میں بہت ساری حقیقتیں پوشیدہ تھیں ہم عوامی جمہوری انقلاب کے علمبردار تھے اسی لیے اخبار کا نام عوامی جمہوریت رکھا گیا۔

ناہمواری' تاریخی عمل کا سب سے اہم عمومی قانون ہے یہ قانون پسماندہ ممالک میں سب سے زیادہ کارفرما ہے پسماندہ سرمایہ دارانہ ممالک کے حکمران طبقات تاریخ اور معیشت کے میدان میں بہت تاخیر سے داخل ہوئے لہذا ان ممالک میں ابھرنے والی سرمایہ داری وہ فرائض مکمل نہ کرسکی اور نہ کرسکتی تھی جن کو قومی ترقی یافتہ ممالک میں برپا ہونے والے صنعتی انقلابات کے ذریعے مکمل کیا گیا جن فرائض کی ان انقلابات نے تکمیل کی ان میں قومی ریاست اور جدید قوم کی تشکیل' زرعی انقلاب اور زمینوں کی تقسیم' مذہب کی ریاست سے علیحدگی سیکولر ریاست کا قیام' بنیادی ڈھانچہ کی تعمیر اور اس کی بنیاد پر اقتصادی اور معاشی ترقی سماج میں قانون اور جمہوری حقوق کی فراہمی اور جمہوری پارلیمان کا قیام شامل تھے

پسماندہ ممالک میں سامراجی لوٹ کھسوٹ کی وجہ سے وہ وسائل مہیا نہ ہوئے جن کی بنیاد پر وہ اقتصادی ڈھانچہ استوار ہوتا جو قومی جمہوری انقلاب کا خاصہ تھا اس کمزوری کے باعث پسماندہ ممالک کے سماج کا ارتقا انتہائی بے ہنگم' ناہموار اور بیہودہ شکل اختیار کرتا چلا گیا اگر غور سے دیکھیں تو پاکستانی سماج کی مسخ شدہ شکل اور انسانی بدحالی اسی تضاد کا نتیجہ ہے اس سے تو انکار نہیں ہوسکتا جدیدیت اور پسماندگی آپس میں گلے ملتے ہیں لہذا سماجی ارتقا میں پسماندہ ممالک ترقی یافتہ ممالک کی پیروی کرنے پر مجبور ہوتے ہیں لیکن ان کا ارتقا ضروری نہیں اسی ترتیب اور تناسب سے چلے جس رفتار اور طرز سے ترقی یافتہ ممالک اپنے ارتقا کے عمل سے گزر رہے ہوں پسماندہ ممالک کو اس تاریخی مراحل کو پھلانگنے کی اشد ضرورت ہوتی ہے مگر پسماندہ ممالک کے حکمران طبقات اپنی تاریخی اور اقتصادی کمزوری کی وجہ سے ان معاشروں کو ترقی یافتہ اور جدید بنانے کی اہلیت سے دور ہوتے ہیں۔ پسماندہ ممالک کے حکمران طبقات کا جاگیرداری کی باقیات سے بندھن ہے اور پسماندہ ممالک کی سرمایہ داری سامراجی سرمایہ سے جڑی ہوئی ہے۔

ان میں گماشتہ پن کا پہلو بہت نمایاں ہوتا ہے اس لیے اپنے تاریخی فریضہ پورے کرنے سے قطعی طور پر قاصر ہے۔

اب یہ اہلیت کس میں ہے؟ سرمایہ دار طبقے کے روبرو اس وقت جتنے طبقے کھڑے ہیں ان سب میں ایک مزدور ہی حقیقت میں انقلابی ہے مزدور جو سماج میں سب سے نچلے درجے پر ہے اور جب تک وہ مروجہ سماج کی بالائی پرتوں کے تمام تار و پود نہ بکھیر دے وہ نہ تو جنبش کرسکتا ہے اور نہ سر اٹھا سکتا ہے یعنی اب یہ فریضہ محنت کش طبقے اور محنت کش کی حمایت پر مبنی انقلابی پارٹی ہی ادا کرسکتی ہے محنت کش طبقہ جب اقتدار پر قابض ہوگا' دوہرا کردار ادا کرے گا ایک طرف قومی جمہوری انقلاب کی تکمیل کرے گا صنعتی ڈھانچہ کی تعمیر کرتے ہوئے اس سطح پر لے جائے گا جس پر صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک کھڑے ہیں۔ جاگیرداری کا خاتمہ کرے گا دوسرا وہ استحصال کی تمام شکلوں کا خاتمہ کرتے ہوئے سماج کو منافع کی بجائے انسانی ضرورتوں کے تابع کرے گا یہی عوامی جمہوری انقلاب تھا جس کا ہم لمبے عرصے سے پرچار کررہے ہیں جیسے کہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے قومی جمہوری انقلاب نے جدید قومی ریاست قائم کی جدید قوم کی تشکیل دی لیکن پسماندہ ممالک کی طرح پاکستان میں دوسرے مسئلوں کی طرح قومی سوال شدومد سے موجود ہے۔

قومی مسئلے کو پنجاب میں اتنی شدت سے محسوس نہیں کیا جاتا جتنا دوسرے صوبے کرتے ہیں پنجاب میں بعض حلقوں میں بالادست قوم پرستی کے تعصّبات پائے جاتے ہیں اسی لیے دوسرے صوبوں میں گمان گزرتا ہے کہ شاید پنجاب کا بائیں بازو بھی انہی تعصّبات کا شکار ہے۔

ایسا نہیں ہے پارٹی لیڈرشپ قومی سوال پر ایک واضح موقف رکھتی ہے پھر بھی اس میں ڈائیلاگ کی ضرورت رہتی ہے جیسے کہ آزادی کی تحریکوں اور نوآزاد ممالک کے اندر بایاں بازو کے رجحانات رکھنے والی قوم پرست جماعتوں کی جانب سے اکثر و بیشتر اشتراکی لٹریچر سے رہنمائی لیتا ہے پھر کیوں نہ اس موضوع پر مارکس کے خیالات سے آگاہی حاصل کی جائے وہ مارکس جس کی تجزیاتی حسیں غیر

معمولی طور پر تیز تھیں جس میں نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت لاثانی تھی اس کا وژن محدود نہ تھا اس کی بصیرت زماں ومکاں کے حوادث کے آر پار کام کررہی ہوتی تھیں۔ مارکس نے تاریخ اور سیاست کے بارے میں مختلف خیالات کے اندر اس سے بیشتر افراتفری اور یکطرفہ فیصلوں کا جو بازار گرم تھا اس کی جگہ نمایاں طور پر ایک مربوط اور ہموار سائنسی نظریہ پیش کیا نیشنل ازم کے حوالے سے مارکس کی فکری روایت اس لحاظ سے اہم ہے اس نے اپنے زمانے کے اہم سماجی اور سیاسی رجحانات کی تشریح کی جو وقت کی رو میں بہہ جانے کی بجائے سائنسی انداز سے ان مسائل کو سمجھنے کی طرف مائل کرتی ہے

مارکس نے نیشنل ازم پر کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں چھوڑی مگر ان کی مختلف تحریروں میں خاص کر مکاتیب اور مراسلوں میں نیشنل ازم کا ذکر موجود ہے ان کی منتشر تحریروں کو یکجا کر کے نیشنل ازم کی بابت ان کی طرز فکر کو سمجھنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔

مارکس کو نیشنل ازم کے حوالے سے پہلا واسطہ پرودھون کی فکر سے پڑا وہ قومی سوال کی موجودگی سے انکاری تھا وہ سمجھتا تھا کہ قومیں فرسودہ تعصبات کی پیداوار ہیں اگر چہ مارکس کا رویہ قومی سوال کی طرف انتہائی تنقیدی تھا مگر وہ اس کی تاریخی اضافی اہمیت کو تسلیم کرتا تھا تاریخی لحاظ سے یکے بعد دیگرے آنے والے سماجی نظام و انسانی سماج کے ارتقاء کے لامحدود دھارے میں نیچے سے لے کر اوپر تک محض عبوری منزلیں ہوتی ہیں یہ منزلیں ضروری ہیں اسی لیے اس وقت اور حالات کے لیے مناسب ہوتی ہیں جن کی وہ پیداوار ہوتی ہیں وہ قومی تحریکوں کے تاریخی جواز کو اہم سمجھتا تھا اس کا نظریہ قومی سوال کو نظرانداز کرنے سے دور تھا۔

مارکس کو بازینی کٹر قوم پرست جیسی شخصیت سے بھی واسطہ پڑا جدلیاتی فلسفے کے لیے کچھ بھی ختم، قطعی اور مقدس نہیں ہے مارکس کا خیال تھا کہ انتہائی محدود اور بندھی ٹکی تاریخی جدوجہد سے آگے بورژوا قوم پرستی کی حمایت کی جاسکتی ہے پرولتاریہ طبقہ قوم پرستی کی کسی بھی قسم کی دائرہ بندی کی حمایت نہیں کرسکتا اس کے برعکس یہ ہر اس چیز کی حمایت کرتا ہے جو قومی امتیاز کو مٹاتی ہے جو قومی دیواروں کو ڈھاتی ہے یہ ہر چیز کی حمایت کرتا ہے جو قوموں کے میل جول کو بڑھاتی ہے یعنی مارکسزم نے بھانت بھانت کی قوم پرستی کے بجائے بین الاقوامیت کا تصور اور تمام قوموں کے اتحاد کا تصور پیش کیا مارکس کو اس بارے میں ذرہ بھر شبہ نہ تھا کہ مزدور کے سوال کے مقابلے میں قومی سوال کی اہمیت ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ سرمایہ دار طبقہ کے خلاف مزدور کی جدوجہد معنوی اعتبار سے تو نہیں مگر اپنی صورت میں شروع شروع میں ایک قومی جدوجہد ہوتی ہے ظاہر ہے ہر ملک کے مزدور کو سب سے پہلے اپنے سرمایہ دار طبقے سے نبٹنا پڑتا ہے مزدور طبقے کو کیونکہ سب سے پہلے سیاسی اقتدار حاصل کرنا ہے ترقی کر کے قوم کا اگلا طبقہ بننا ہے اس لیے اس حد تک قومی ہے

ایک اعتبار سے مارکس کی تشریح کی عملی افادیت ہے کہ مختلف طبقات کے لیے جو براہ راست مارکسزم کا محور ہیں نیشنل ازم کے حوالے سے ایک لائحہ عمل بھی تجویز کرتا ہے مارکس کا خیال تھا کہ قومی تحریکوں کا اپنا طبقاتی کردار ہوتا ہے ان تحریکوں کے اندر مختلف طبقات کے اتحاد پائے جاتے ہیں محنت کش طبقے کے لیے صرف ایسی تحریکوں کی حمایت کارآمد ہوسکتی ہے جو تحریکیں سماجی نظام کو آگے لے جانے کی اہلیت رکھتی ہیں ان تحریکوں میں شمولیت اختیار کر کے محنت کش طبقات اس عمل کو مہمیز کرتے ہیں۔

انیسویں صدی کے دوران پولینڈ اور آئرلینڈ کے مسئلے نے مزدور تحریک کو اپنی طرف متوجہ رکھا تھا مارکس نے اس مسئلے کو سرسری طور پر نہیں بلکہ جدلیاتی انداز سے بڑی تفصیلی نگاہ سے دیکھا ان دونوں کی طرف مارکس کے رویے کا اندازہ اس کی عالمی انقلاب سے وابستہ حکمت عملی سے ہوتا ہے ۱۸۴۰ء اور ۱۸۵۰ء کی دہائیوں میں مارکس کا خیال تھا کہ آئرلینڈ اس وقت آزادی حاصل کرسکتا ہے جب انگلینڈ کا محنت کش طبقہ فتح مند ہو۔

یہ بات خود انگریز مزدور طبقے کے براہ راست قطعی فائدے میں ہوگی کہ وہ آئرلینڈ کے ساتھ موجودہ بندھنوں سے چھٹکارا پائے انگلستان میں انگریز رجعت پرستی کی جڑیں آئرلینڈ کی محکومی میں پیوست ہیں۔ آئرلینڈ کی محکومی سے انگریز رجعت پرستی مضبوط ہوتی ہے اور پھیلتی پھولتی ہے۔

بہرحال حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا انگریز مزدور طبقہ کافی لمبی مدت کے لیے لبرلوں کے اثر میں چلا گیا اور لبرلوں کا دم چھلا بن گیا اس نے لبرل لیبر پالیسی اپنا کر خود کو ناکارہ اور ناتواں کرلیا دوسری طرف آئرلینڈ میں بورژوا تحریک آزادی نے زیادہ زور پکڑا اور انقلابی روپ اختیار کرنے لگی تو مارکس نے اس بارے میں اپنی پوزیشن تبدیل کی یعنی ۱۸۶۰ء میں اس کا ذہن بدل گیا اور اس نے یہ نقطہ نظر اپنایا کہ آئرلینڈ میں بیداری کی چنگاری انگلینڈ میں انقلاب برپا کرسکتی ہے۔ ابتدا ہی سے مارکس نے واضح کردیا تھا کہ آئرلینڈ کی قومی آزادی مکمل طور پر سماجی آزادی کے ساتھ منسلک ہے خصوصاً زمین کے مسئلے کے انقلابی حل کے ساتھ' انگلینڈ کے زمین داروں کی بڑی بڑی جاگیریں آئرلینڈ میں تھیں اور آئرلینڈ ہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں اس پر کاری ضرب لگ سکتی ہے۔ (باقی صفحہ 35 پر)

پاکستان کی سیاست عابد حسن منٹو کی نظر میں

گلزار چنا

کچھ دن قبل سینئر ساتھی اور بائیں بازو کے نامور سیاسی رہنما کامریڈ حسن عسکری کی خیریت معلوم کرنے سانگھڑ جانا ہوا رخصتی کے وقت کامریڈ نے دو کتابوں کے تحفے دیے دونوں کتابیں بزرگ کامریڈوں کی سوانح عمری پر تھیں ان میں سے ایک کتاب ایڈوکیٹ عابد حسن منٹو صاحب کی ''اپنی جنگ رہے گی'' تھی جو میں نے گھر پہنچتے ہی پڑھنا شروع کی پڑھنے کے دوران ذہن میں خیال پیدا ہوا کیوں نہ اس کتاب پر اپنی ناقص سمجھ سے تبصرہ لکھوں

ویسے سوانح عمری تحریر کرنے سے جو مقصد ہوتا ہے کوئی شخص جو اپنی زندگی کے اچھے برے تجربات پڑھنے والوں کے سامنے لاتا ہے لیکن منٹو صاحب کی یہ کتاب منفرد اس لیے ہیں کہ نہ صرف ذاتی زندگی کا احوال بیان کرتی ہیں بلکہ پاکستان کے اندر ترقی پسند اور کمیونسٹ تحریک کی تاریخ بیان کرتی ہیں۔

کمیونسٹ تحریک کے حوالے سے ہمارے یہاں زیادہ تر مواد سندھ کے حوالے سے ملتا ہے پنجاب تو بڑی آبادی کا صوبہ ہے وہاں کیا کچھ ہوا اس کے بارے میں ہم زیادہ تر انجان رہتے ہیں نتیجتاً زیادہ تر غلط فہمیاں ہمارے ذہنوں پر سوار ہوتی ہیں اس کتاب میں مجموعی طور پر ملک اور بالخصوص پنجاب کی سیاست کا ذکر ہے ایک ایسا شخص جو اپنی زندگی کے ۶۸ برس سے سیاست ادب اور وکالت کے شعبے میں جفاکشی کرتا چلا آ رہا ہے ۸۵ برس ہونے کے باوجود بھی سماجی تبدیلی کے لیے آپ کے جذبات تھکے نہیں۔ منٹو صاحب کی اس کتاب پر تبصرہ کرنے کی میں نے اپنی طرف سے بھرپور کوشش کی ہے

اردو زبان میں اپنی جنگ رہے گی کتاب سانجھ پبلی کیشنز نے شائع کی ہے جو بڑے سائز کے ۳۸۲ صفحات پر مشتمل ہے یہ کتاب ۲۰۱۶ کے آخری مہینوں میں شائع ہو کر منظر عام پر آئی کتاب کا پیش لفظ منٹو صاحب نے خود لکھا ہے۔ جس میں ۱۹۴۸ء سے لے کر ملکی سیاست کا بیان اور ۱۹۵۴ء میں کمیونسٹ پارٹی ٹریڈ یونین ادبی محاذ خواتین محاذ اور طلبہ محاذ پر پابندیاں لگنے کے بعد انڈر گراؤنڈ ہو کر سیاست کرنا۔ نیپ کی سیاست سے اختلافات اور اس دور میں ذوالفقار علی بھٹو کے حکومتی کارناموں پر تفصیل سے لکھا ہے۔ وکلا تحریک ادبی محاذ ٹریڈ یونین سیاست کسانوں کے حقوق تک کی تحریکوں میں انکی پارٹی کا کردار اور اس دور کے بارے میں اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے جو کہ آج کے سیاسی و معاشی اور سماجی حالات پر پورا اترتا ہے۔ ۱۹۴۸ء سے ۲۰۱۲ کی عوامی ورکرز پارٹی کے سارے سفر میں جو توڑ پھوڑ ہوئی ہے اس میں ان کا کردار ایک ایماندارانہ رویہ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جس سے ایک اقرار نامہ ہے کہ اس ساری توڑ پھوڑ سے سیکھا ہے۔

کامریڈ عابد حسن منٹو کی یہ کتاب ان کی ذاتی زندگی پر مشتمل ہے ذاتی زندگی سے میرا مقصد ہے کہ ان کی وکالت کا دور اور سیاسی زندگی کے تجربات جو پاکستان بننے سے اب تک ہیں

کامریڈ منٹو کی یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے جس میں ایک باب سیاسی دستاویز پر مشتمل ہے جو آپ کی پارٹی مختلف وقتوں پر بین الاقوامی اور ملکی سیاسی سماجی اور معاشی صورت حال کا تجزیہ جو ۱۹۷۳ء سے ۱۹۸۸ء تک کی سوشلسٹ پارٹی کی کانگریس میں پیش کیے گئے تھے ان دستاویزات میں شروع کے صفحات میں عالمی صورت حال کے اس دور میں امریکی سامراجیت کی شکل اور جنگی کاروائیوں کا تجزیہ کیا ہے مثلاً ایک صفحہ ویتنام میں امریکی شکست کے بارے میں رقمطراز ہیں اور عرب خطے میں یمن کی عوامی جمہوریہ کا پائیدار ہونا اس کے ساتھ ساتھ وسطی مشرق کے عرب ممالک اور غیر ممالک میں تشدد کے باوجود وہاں آزاد خیال ترقی پسند اور انقلابیوں کا مسلسل سیاسی عمل میں رہنا اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے انگولا اور موزمبیق میں آزادی کی جدوجہد کا آگے بڑھنا اور لاطینی امریکہ میں کیوبا سوشلسٹ حکومت کا مستحکم ہونا اور چلی کے عام انتخابات میں ایک مارکسی رہنما کا ریاستی سربراہ ہونا اور خود امریکا کے اندر رائے عامہ کا امریکی حکمرانوں کے سامراجی سیاست کے خلاف زیادہ سے زیادہ منظم ہونا اور دوسری طرف امریکی معیشت کا کمزور ہونا اس کے باوجود ایشیا' افریقا اور لاطینی امریکا میں عوام دوست قوتیں انقلاب برپا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتیں اس قسم کے قومی بین الاقوامی اور علاقائی مسائل کے ساتھ دو بڑے سوشلسٹ ممالک کی آپس میں چپقلش کی وجہ سے انقلاب اور جدوجہد کے راستوں میں رکاوٹیں پیدا ہوئی ہیں ملکی مسائل کا حل دیتے ہوئے منٹو صاحب لکھتے ہیں کہ جب تک ہمارے ملک کا نظام سامراجی اور جاگیر دارانہ معیشت پر مبنی رہے گا یہاں نہ تو حقیقی جمہوریت قائم ہو سکتی ہے اور نہ علاقائی خودمختاری اور اقوام کے مسائل کا صحیح حل ممکن ہے۔

پاکستان پیپلز پارٹی کے ابتدائی طوفان اور بنگلہ دیش کی آزادی کے بارے میں منٹو صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے کس طرح مغربی پاکستان کے حکمرانوں نے امریکی سامراج کے گٹھ جوڑ سے پاکستان کے ٹکڑے کیے

بلوچستان اور سرحد میں ذوالفقار علی بھٹو کا نیپ کی حکومت گرانے پر کچھ بائیں بازو کے لیڈران نے خوشی کا اظہار کیا تھا اور انہوں نے نیپ پر تنقید کرتے ہوئے ان کی حکومت کو وحشت اور بربریت کا خاتمہ قرار دیا تھا

اس دستاویز میں خود تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے یہ بات قبول کرتے ہیں کہ

پچھلے برسوں میں عوام کواس انداز میں منظم نہ کرنے کا اعتراف کرتا ہوں جتنے کام کی ضرورت تھی لیکن اس کے معروضی اسباب بھی ہیں کہ ''وہ زمانہ ایک حوالے سے سختیوں کا تھا جب سوشلزم اور کمیونزم کا لفظ استعمال کرنے پر اسلام دشمنی کا لیبل لگا دیا جاتا تھا امریکی سامراج کہنا قابل گرفتاری تھا اور بیرونی قرضوں کی مخالفت کرنے والوں کو ملک دشمن سمجھا جاتا تھا جب ترقی پسند لٹریچر رکھنا پڑھنا اور بیچنا ایک بڑا کٹھن کام ہوا کرتا تھا اس زمانے میں صنعتیں نہ ہونے کے برابر تھیں اس لیے مزدور محدود تھے اور پنجاب میں پاکستان کا مطلب کسی نہ کسی طریقہ سے مسلم لیگ سمجھا جاتا تھا۔''

دوسرا باب عوامی جمہوریت کے ایڈیٹوریل مضامین ہیں جو وقت بہ وقت حالات حاضرہ پر لکھے تھے پاکستان کے تاریخی پس منظر، حکمران طبقات کی لوٹ کھسوٹ فوج کا طاقت ور ہونا جاگیرداری نظام میں رکاوٹیں اور دہشت گردی کے خلاف جنگ میں انسانی جانیں اور ملکیتوں کا نقصان اور اس کے نتیجے میں ہونے والے بحران کے حل کے بارے میں مضامین ہیں۔

ملکی وسائل کا حل دیتے ہوئے منٹو صاحب کا خیال ہے کہ ایک پائیدار جمہوری نظام کے قیام کے لیے ضروری ہے کہ لبرل پالیسی کے نفاذ کے خلاف مزاحمت اور خود انحصاری کی بنیاد پر صنعتی ترقی میں ریاست کا موثر اور مثبت کردار ہونا چاہیے تاکہ ملک میں منصفانہ اقتصادی نظام کی داغ بیل ڈالی جائے اور ملکی وسائل کی از سر نو تقسیم کی جائے ملک کی اکثریتی آبادی جو جہالت غربت اور پسماندگی کا شکار ہے وہ بنیاد پرستوں اور کئی طرح کے دہشت گردوں کے ظلم کا شکار بھی ہے ان کو ان مسائل سے نجات دلائی جائے اس لیے بنیادی تبدیلی ایک طاقت ور عوامی تحریک کا تقاضا کرتی ہے جو ایسی نئی قیادت کی رہنمائی میں جمہوری نظام قائم کرے جس کا مفاد مروجہ غیر منصفانہ سماجی ڈھانچے سے وابستہ نہ ہوتا کہ ایک پائیدار جمہوری تبدیلی برپا کی جائے اس کے لیے حقیقی جمہوری ڈھانچہ سیاسی، سماجی اور معاشی جدوجہد کے سوائے قائم نہیں ہوسکتا جبکہ کتاب کا تیسرا باب کامریڈ عابد حسن منٹو کی تقریریں ہیں جو انہوں نے سوویت یونین اور مشرق یورپ کے سوشلسٹ ممالک کی صورت حال پر عوامی سیاست کی حکمت عملیوں پر کی ہیں

سوویت یونین کے خلاف لبرل دانشوروں کے پروپگنڈے کے جوابات مدلل طریقے سے دیے ہیں مغربی سرمایہ دار بلاک کی ترقی اور سوویت یونین کی ترقی کا آپس میں تقابلی جائزہ پیش کرتے ہوئے اس باب میں لکھتے ہیں: دوسری عالمی جنگ کے بعد جو دو تین ممالک کے اندر زبردست اقتصادی ترقی سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد پر ہوئی اس میں کوریا اور تائیوان شامل ہیں جن کا زیادہ ذکر کیا جاتا ہے سرمایہ دار دنیا سوشلسٹوں کے جواب میں کہتی ہے کہ دیکھو آپ کہتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام مرنے کی طرف جا رہا ہے حقیقت میں ہم نے کوریا بنایا ہم نے تائیوان کو بنایا جو اس پیمانے پر ترقی یافتہ نہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ تائیوان اور کوریا کی جس قدر بھی اقتصادی ترقی ہوئی اس کے باوجود آج مڈل ایسٹ کے اندر تائیوان اور کوریا کے لوگ پاکستان اور سری لنکا کے لوگوں کے ساتھ بیچے جاتے ہیں اور ان کی قیمت آدھی ہوتی ہے یہ ایک حقیقت ہے اگر سرمایہ دارانہ ترقی کا کوئی فائدہ جنوبی کوریا اور تائیوان کے لوگوں کو پہنچتا تو وہ اپنے ملک سے بھاگ کر مڈل ایسٹ نہ جاتے اس کے برعکس سوشلسٹ ممالک کے لوگ اس طرح نوکری کی تلاش میں جاتے ہیں سوائے مغربی دنیا جو اس سے نسبتاً بہتر حالت میں ہیں یعنی مشرقی جرمنی کے لوگ مغربی جرمنی تو جا سکتے ہیں کیونکہ مشرقی جرمنی میں صنعتی ترقی زیادہ ہے

کامریڈ اسٹالن پر لگے الزامات کے جواب میں کامریڈ منٹو کہتے ہیں: اسٹالن میں عیب ضرور ہوں گے لیکن انہوں نے سوویت یونین روس کو بہت جلد دنیا کی ایک بہترین انڈسٹریل، طاقت ور سپر پاور بنا دیا اور دوسری عالمی جنگ میں کامیابی سے ہمکنار کیا اسٹالن کے ایسے کارناموں کا ذکر بھی ہونا چاہیے۔ اس کے ساتھ منٹو صاحب سوویت یونین کی خرابیوں کا تجزیہ بھی پیش کرتے ہیں خرابیوں کا سبب پارٹی کے اندر جمہوری مرکزیت کے خاتمے کو سمجھتے ہیں

سوویت یونین کا مکمل دفاع کرنے والوں کے برعکس منٹو صاحب کا خیال ہے کہ ہمارے ملک کے حالات مختلف ہیں۔ ہمارے ہاں جاگیرداری، قبائلیت اور ملائیت ہیں اس لیے ہمارے یہاں کون سی پالیسی اپنانی چاہیے وہ ہمیں اپنے معروضی حالات سے طے کرنا ہے کسی ملک کی نقل نہیں کر سکتے۔ اپنی جنگ رہے گی کا پانچواں باب انٹرویوز پر مشتمل ہے۔ کامریڈ عابد حسن منٹو اپنے انٹرویو میں پاکستانی میڈیا کو اور ملک کے باہر اپنے ہمدردوں کو پاکستان کے اندر کمیونسٹوں کے خلاف الزامات کے جوابات دیتے ہیں اور پاکستان کی پارلیمانی سیاست کی حکمت عملیاں سمجھاتے ہیں ساتھ ہی ساتھ مجموعی عدالتی تاریخ اور اس کی کارکردگی کے بارے میں میڈیا کی طرف سے سوالات پوچھے گئے ہیں کچھ انٹرویو میں ایسے سوالات پوچھے گئے ہیں جو غصہ دلانے والے ہیں جن کے منٹو صاحب نے بڑے تحمل سے جوابات دیے ہیں۔

پاکستان میں پنجاب کا چھوٹے صوبوں اور ان کی قوموں کے جائز حقوق ہڑپ کرنے کے سوال کا جواب سیدھا سادا دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ بالکل یہ بات درست ہے کہ پنجاب کا دوسرے صوبوں کے حقوق کو ہڑپ کرنے کا الزام رد نہیں کیا جاسکتا قومی حقوق کی جدوجہد ضروری ہے مگر اس کے ساتھ چھوٹے صوبے یا قوموں کے اندر وڈیروں لٹیروں اور حکمران طبقات کے جبر سے لڑنا بھی فرض ہے سیاسی کارکنوں کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ انہیں ڈپلومیسی اپنانی چاہیے تاکہ ملکی سیاسی حالات کو عالمی صورت حال کے پاس منظر میں سمجھا جاسکے۔

☆☆☆

شانتا بخاری

ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

مہناز رحمان

سب سے پہلے تو مجھے اعتراف کرنے دیجیے کہ میں شانتا بخاری سے ان کی زندگی میں ملنے سے محروم رہی، یہ تو اب چند سالوں سے اخبار و جرائد میں ان کے بارے میں مضامین پڑھنے کا اتفاق ہوا تو بارہا خود سے پوچھا کہ آخر کیوں میں ایسی بے لوث کمیٹڈ ٹریڈ یونین رہنما کے بارے میں پہلے جان نہیں پائی۔ شاید یہ بھی اس نظریاتی تقسیم کا نتیجہ تھا جس نے ہمیں ڈبوں میں بند کر رکھا تھا۔ ریاض شیخ نے شانتا کے بارے میں بات کرنے کے بارے میں کہا تو ان کے بارے میں زیادہ جاننے کی کوشش کی۔ ان کے حالاتِ زندگی پڑھنے کے بعد بے اختیار یہی خیال آیا:

یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی!

ذرا اس چھوٹی سی بچی کے بارے میں سوچیے جو پہلے ماں باپ کے سائے سے محروم، پھر نانی کی شفقت سے محروم ہوگئی اور پھر آٹھ سال کی عمر میں اپنی خالہ کے ساتھ رہتے ہوئے پڑھائی کے ساتھ کارخانے میں مزدوری کرنے لگی ہو یعنی ایک ننھی منی پرولتاریہ اور سیلف میڈ کی تعریف پر پورا اترنے والی ہماری شانتا بخاری جو آنے والے دنوں میں پاکستانی کمیونسٹوں کی اماں کہلائیں۔ اسے خوبیِ قسمت ہی کہیں گے کہ شانتا کے خالو کمیونسٹ پارٹی کے کل وقتی رکن اور خالہ بھی پارٹی کی سرگرم رکن تھیں۔ بارہ سال کی عمر میں شانتا نے پڑھائی چھوڑ دی اور کل وقتی مزدوری کرنے کے ساتھ کمیونسٹ پارٹی کی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگیں۔ 1942ء ان کی کامریڈ جمال بخاری سے شادی ہوگئی۔

پاکستان کی تاریخ میں بہت کم عورتوں نے ٹریڈ یونین رہنما کا کردار ادا کیا۔ ہم نے اپنے اسکول کے زمانے میں لائل پور کی صبیحہ شکیل اور یونیورسٹی کے زمانے میں کراچی کنیز فاطمہ اور صحافت میں آنے کے بعد اسٹیل ملز کی گلزار بیگم کی جدوجہد کے بارے میں تو جانتے تھے۔ لیکن شانتا کی انفرادیت اس میں ہے کہ انہوں نے بچپن ہی مزدور خواتین کے لیے اپنی جدوجہد کا آغاز کر دیا تھا۔ قیامِ پاکستان سے پہلے ہی ان کا شمار مقبول خواتین مزدور رہنماؤں میں ہونے لگا تھا۔

پاکستان آنے کے بعد انہوں نے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی کی تاریخ کے حوالے سے راولپنڈی سازش کیس ایسا ہمارے ذہنوں پر چھایا کہ کچھ یاد ہی نہ رہا۔ کسی نے ہمیں شانتا جیسی عورتوں کے بارے میں بتایا ہی نہیں جنہوں نے پاکستان بننے سے پہلے کارخانوں میں کام کیا اور کمیونسٹ پارٹی کی رکنیت اختیار کی۔ آج اتنے برسوں بعد ہم گھر مزدور اور گھریلو ملازماؤں کے حقوق کی بات کر رہے ہیں، ان کے لیے پالیسیاں اور قوانین بنوا رہے ہیں، لیکن شانتا نے تو نامساعد حالات کے باوجود پاکستان کے ابتدائی زمانے میں ہی گھروں اور فیکٹریوں میں کام کرنے والی عورتوں کے لیے 'خدمتگار یونین' بنوائی اور ان کے حقوق کے لیے آواز بلند کی۔ انہوں نے چوڑیوں کی صنعت اور کپڑے کے کارخانوں میں کام کرنے والی عورتوں کو بھی منظم کیا۔ وہ ایسی کئی رفاہی تنظیموں کی بانی 'صدر رہیں۔ ان کی زندگی کا مشن عورتوں کو استحصال سے نجات دلانا اور عزت اور وقار کے ساتھ روزی کمانا سکھانا تھا۔

پاکستان کے ابتدائی سالوں میں پہلے تو ان کے شوہر جمال بخاری کو کمیونسٹ ہونے کے جرم میں گرفتار کیا گیا اور پھر رہائی کے بعد کراچی سے نکل جانے کا حکم دیا گیا چنانچہ یہ لوگ لاڑکانہ منتقل ہوگئے۔ لاڑکانہ جا کے بھی معاشرے میں عورتوں کے مقام کو بلند کرنے کے لیے شانتا نے اپنا کام جاری رکھا۔ اس زمانے میں لاڑکانہ میں گومی بائی لیڈیز کلب ہوا کرتا تھا جو اُمرا اور سرکاری افسران کی بیگمات کے لیے مخصوص تھا۔ عام عورتوں کو اس کلب میں جانے کی اجازت نہیں تھی لیکن شانتا بائی نے کسی نہ کسی طرح دستکاری کی ماہر ہنرمند خواتین کو کلب میں داخلے کی اجازت دلوا دی۔ ان کی بنائی ہوئی اشیا کلب میں فروخت کے لیے رکھی جانے لگیں۔ یوں ان عورتوں کی آمدنی میں اضافہ ہوا اور سندھ کی ثقافتی اشیا کو مقبولیت حاصل ہوئی۔

سوبھو گیان چند کہا کرتے تھے کہ شانتا بخاری کمیونسٹوں کے لیے یونیورسٹی کا درجہ رکھتی ہیں وہ کمیونسٹ پارٹی کی ایک سچی اور بے لوث کارکن تھیں۔ انہوں نے

ہندوستان میں احمد آباد میں ایک ٹیکسٹائل مل میں ایک مزدور کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا کیا اور آگے چل کر کمیونسٹ پارٹی کی ایک جانثار کارکن بنیں۔ 1943ء میں اسلام قبول کرنے کے بعد ان کی کامریڈ جمال بخاری کے ساتھ شادی ہوئی۔ اور دونوں پاکستان چلے آئے۔ اس وقت جمال بخاری پاکستان کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکریٹری تھے۔ شانتا اپنے شوہر کے شانہ بشانہ انقلابی آدرش کے لیے کام کرتی رہیں۔ سوبھوگیان چندانی کے بقول شانتا ایک کثیرالجہتی شخصیت تھیں۔ ان کے دروازے غریبوں' مزدوروں' کارکنوں اور عورتوں کے لیے ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔ وہ صحیح معنوں میں ان کے دکھ درد کی ساتھی تھیں۔ بقول شخصے شانتا جیسی خواتین صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ ہمت' جرأت اور استقامت کی پیکر تھیں۔ زندگی میں آنے والے نشیب وفراز نے ان کے عقائد کو متزلزل نہیں کیا۔ انہوں نے گیارہ سال کی عمر میں احمد آباد (ہندوستان) میں کمیونسٹ پارٹی میں شمولیت اختیار کی اور پارٹی کے خواتین ونگ کی قیادت کی۔ وہ پیدائشی طور پر قائدانہ صلاحیتوں سے مالا مال تھیں۔ انہوں نے عمر بھر کارکنوں ٹریڈ یونین کی شکل میں منظم کرنے کے لیے کام کیا۔ انہوں نے آٹھ سال کی عمر میں راجپوتانہ کی ایک کاٹن فیکٹری میں مزدوری شروع کی تھی۔ انہوں نے اپنی ذہانت اور خواتین مزدوروں کی محرومیوں' مسائل اوران کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے براہ راست مشاہدے کی وجہ سے انہیں لیبر یونین بنانے کی اہمیت کا احساس ہوا۔

پاکستان آنے کے بعد انہوں نے خاتون مزدوروں سے رابطے کیے اور ان کی یونین بنوائیں۔ مثال کے طور پر حیدر آباد چوڑیاں بنانے والی عورتوں کی یونین' دائیوں کی یونین' میونسپل سینیٹری ورکرز کی یونین اور گھریلو ملازماؤں کی یونین۔ شانتا محنت کشوں میں بے حد مقبول تھیں اور محنت کش عورتیں انہیں اپنا نجات دہندہ سمجھتی تھیں۔

پاکستان میں راولپنڈی کیس کے بعد کمیونسٹ پارٹی پر پابندی لگ گئی تھی اور کمیونسٹوں کے لیے ترقی پسند ادیبوں کی تحریریں اور ٹریڈ یونین کا پلیٹ فارم ہی بچا تھا۔ دوسرے مارکس کے زمانے میں ہی ٹریڈ یونین کو بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے۔ کیونکہ یہ محنت کشوں کی براہ راست طبقاتی سرگرمی کی نمائندگی کرتی ہیں۔ پہلی جنگِ عظیم' روسی انقلاب اور عالمی ادارۂ محنت کے قیام کے ساتھ ہی ٹریڈ یونینوں کی تعداد میں اضافہ شروع ہو گیا تھا صنعتی تنازعات بڑھنے لگے تھے۔ 1920ء اور 1924ء کے دوران ایک ہزار ہڑتالیں ہوئی تھیں۔ ہڑتالوں کے دوران ان لہروں میں زیادہ ابھار کان سازش کیس 1924ء میں ممتاز رہنماؤں کی گرفتاری کی وجہ سے آیا۔ یونینوں کے رہنماؤں پر برطانوی حکومت کا تختہ الٹنے اور کمیونسٹ انقلاب لانے کی کوششوں کا الزام تھا۔ 1926ء میں ٹریڈ یونین ایکٹ منظور ہوا تا کہ ٹریڈ یونینوں کی نگرانی کی جا سکے اور ان کے لیے قوائد وضوابط بنائے جا سکیں۔ اس وقت اٹھائیس یونینوں نے خود کو رجسٹرڈ کروایا تھا اور ان کے ارکان کی تعداد ایک لاکھ چھ سو نیس تھی۔ اس کے بعد یونینوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ بہت کم پاکستانیوں کو یہ بات معلوم ہوگی کہ پاکستان کے بانی محمد علی جناح بھی ٹریڈ یونین لیڈر رہے تھے' وہ 1925ء میں آل انڈیا پوسٹل اسٹاف یونین کے صدر منتخب ہوئے تھے۔

کارل مارکس کے بقول بنی نوع انسان کی اب کی تاریخ طبقاتی جدوجہد کی تاریخ ہے۔ نظام کو تبدیل کرنے کی پرولتاریہ کی جدوجہد ایک سیاسی جدوجہد ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ اقتصادی جدوجہد بھی ہے کیونکہ پرولتاریہ اپنے معیارِ زندگی' حالات کار اور معاوضہ کو بہتر بنانا چاہتے ہیں۔ اس اقتصادی جدوجہد کو مربوط اور منظم بنانے کے لیے ٹریڈ یونین کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس پرولتاری تحریک میں عورتیں مرد محنت کشوں کے ساتھ ساتھ رہیں۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد عورتوں کی اقتصادی سرگرمیوں میں زیادہ اضافہ ہوا۔ پاکستانی عورتوں کی بڑی تعداد اقتصادی شعبوں میں داخل ہو چکی ہے مگر عورتوں کو مردوں سے کم معاوضہ ملتا ہے۔ ٹریڈ یونین تحریک میں بھی عورتیں کم نظر آتی ہیں۔ ویسے عورتوں کو بہت سے شعبوں میں امتیازی سلوک کا سامنا ہے۔ لیکن لیبر مارکیٹ میں عورتوں کے لیے حالات زیادہ ہی خراب ہیں۔ عورت اور مرد کے جسمانی فرق کو عورت کے اقتصادی استحصال کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

عورت گھر میں جو کام کرتی ہے اسے کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ بچوں کی دیکھ بھال کرنا' کھانا پکانا' گھر کی صفائی کرنا صرف اور صرف عورتوں کی ذمہ داری سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ مرد بھی یہ سارے کام کر سکتا ہے۔ معاشرے نے مرد اور عورتوں کے لیے جو کردار بنا رکھے ہیں' آپ کو ان ہی میں فٹ ہونا پڑتا ہے

(باقی صفحہ 35 پر ملاحظہ کیجیے)

عوامی ورکرز پارٹی کی فیڈرل کمیٹی کے اجلاس منعقدہ لاہور 3/4 اگست 2019 کے فیصلے۔

فیڈرل کمیٹی کے اجلاس میں تفصیلا بحث ومباحثے کے بعد مندرجہ ذیل فیصلے کیئے گئے۔

1۔فیڈرل ایگزیکٹو کمیٹی کے توسیعی منعقدہ لاہور26/ 25 مئی 2019 کے مندرجہ ذیل فیصلوں کی ترمیم کے ساتھ منظوری دی گئی۔

(i)ویمن ڈیموکریٹک فرنٹ (WDF) کی تنظیم کو ہر سطح پر تشکیل دیا جائیگا AWP اور DWF ایک دوسرے کی سیاست اور جدوجہد کو مل کر بڑھائینگے، پارٹی یونٹس اور AWP کے مرکزی ،صوبائی ،ضلعی یا مقامی یونٹس میں ویمن سیکریٹری WDF کی سیکریٹری یا صدر ہونگی۔

(ii)ئندہ پارٹی کو کسی بھی دوسری تنظیم سے جو دعوت نامہ بیرون ملک یا اندرون ملک سے موصول ہوگا تو اسکی اجازت پارٹی سے لی جائیگی ، یا پارٹی قیادت سے مشورہ کیا جائیگا اور اگر دعوت نامہ ذاتی نوعیت کا بھی ہو تو اسکی پیشگی اطلاع بھی پارٹی قیادت کو دی جائیگی۔

(iii)سیاسی مسائل کے حوالے سے کسی بھی پارٹی رہنماء کا عوامی سطح پر زبانی یا تحریری اظہار پارٹی پروگرام اور فیصلوں کے طابع اور مطابقت میں ہونا چاہئیے،اس سے الگ ذاتی رائے اور اختلاف پارٹی اداروں کے اندر رکھنا اور بحث سے طے کرنا ہوگا۔

(iv)سوشل میڈیا پالیسی پر سختی سے عمل کیا جائیگا ، بالخصوص پارٹی کے اندرونی کسی بھی تنظیمی یا ذاتی اختلافات کو سوشل میڈیا پر نہیں ڈالا جائیگا۔

(v)پروگریسو اسٹوڈنٹس فیڈریشن (PRSF) کی تنظیمی کمیٹی کے کوآرڈینیٹر یا ذمہ داران AWP کی صوبائی یا ضلعی تنظیموں کے رابطے اور مشورے سے مزید طلباء ساتھیوں کو تنظیمی کمیٹیوں میں شامل کرینگے AWP کی قومی یا ضلعی کمیٹیاں یوتھ سیکریٹری کی عدم موجودگی میں اپنا نمائندہ مقرر کرینگی۔

FEC کے اجلاس کے مزید فیصلے مندرجہ ذیل ہیں:

(1)مزدور کسان پارٹی کی مرکزی قیادت اور خیبر پختون خواہ کی نیشنل پارٹی، مزدور کسان پارٹی اور عوامی ورکرز پارٹی کے صدور کی طرف سے جو خطوط وصول ہوئے جن میں تینوں پارٹیوں کے انظمام کی تجویز دی گئی ہے کو خوش آئند قرار دیا گیا اور فیڈرل کمیٹی نے اتفاق کرتے ہوئے ایک سات رکنی کمیٹی بھی تشکیل دی گئی جس میں پارٹی کے وفاقی صدر اور جنرل سیکریٹری کے علاوہ تمام قومی اکائیوں کے صدور یا انکے نمائندے شامل ہونگے ، وفاقی کمیٹی نے تجویز کیا کہ دوسری دونوں سیاسی پارٹیاں بھی اپنی اپنی مرکزی کمیٹیوں کی رائے سے ایسی ہی کمیٹیاں تشکیل دیں تاکہ انضمام کے لئے باقاعدہ مذاکرات کئے جاسکیں اس سلسلے میں جنرل سیکریٹری تحریر کرینگے، فیصلے کی اطلاع فوری طور پر ان پارٹیوں کے ذمہ داران کو دے دی گئی ہے۔

(2)فیڈرل کمیٹی نے عوامی ورکرز پارٹی کی ایک متحدہ اور منظم پارٹی کے طور پر تعمیر اور اس میں رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے ایک 14 رکنی کمیٹی نامزد کی جس میں:

(1)یوسف مستی خان (2)اختر حسین (3)فاروق طارق (4)عصمت شاہجہاں (5)جاوید اختر (6)صباء الدین صباء (7)حسن عسکری (8)عابدہ چوہدری (9)عاصم سجاد اختر (10)بخشل تھلو (11)حیدر زمان (12)حمزہ ورک (13)خالد محمود اور (14)عابد حسن منٹو۔ یہ کمیٹی اگست کے مہینے میں ہی اپنا اجلاس منعقد کریگی۔

(3)وفاقی سطح پر فیس بک پہ مختلف صوبوں اور اضلاع کی خبروں کی اشاعت نہ ہونے کی شکایات پر طے کیا گیا کہ تمام صوبائی پارٹی یونٹس ایک ایک نام فاروق طارق ،فرمان علی ، یا عمار رشید کو دیں جنکو ایڈمن مقرر کیا جائیگا تا کہ تمام صوبوں کی مکمل خبروں کی اشاعت ممکن ہو سکے۔ بلوچستان سے عبدالباسط کو ایڈمن مقرر کیا جائیگا جنکی تفصیلات اجلاس میں ہی فاروق طارق صاحب کو دے دی گئی۔

(4)جنرل سیکریٹری فیڈرل کمیٹی اور اسکے اراکین کے حوالے سے ایک رپورٹ تیار کرینگے کہ کل کتنے اجلاس منعقد ہوئے ہیں اور کن اراکین نے کتنے اجلاس میں شرکت کی ہے۔(5)پارٹی الیکشن کے حوالے سے طے کیا گیا کہ:

(i)بلوچستان پارٹی کانگریس پہلے ہی منعقد ہو چکی ہے جسکو خوش آئند قرار دیا گیا،اس کے علاوہ تمام صوبائی پارٹی کانگریسیں دسمبر 2019 تک منعقد ہو جائینگی، یہ بھی طے ہوا کہ تمام صوبائی / قومی پارٹی یونٹس اپنے اپنے صوبے کی ممبرشپ فہرست بمعہ ممبرشپ فیس تنظیمی سیکریٹری یا پارٹی جنرل سیکریٹری کو 30 دسمبر سے قبل پہنچادینگے

(ii)فیڈرل پارٹی کانگریس 28 اور 29 مارچ 2020 کو لاہور میں

منعقد ہوگی۔

(iii) فیڈرل کانگریس میں مندوبین کی کل تعداد 525 ہوگی، قومی اکائیوں سے برابری کی بنیاد پر 100/100 مندوبین ہونگے، 20 انگلینڈ پارٹی سے ہونگے، 5 مندوبین مشرق وسطی اور ملائیشیا وغیرہ سے ہونگے، 10 مبصرین گلگت/بلتستان اور 10 جموں کشمیر سے ہونگے۔ مندوبین کی فیس 200 روپے فی مندوب ہوگی۔

(iv) آئندہ فیڈرل کمیٹی کے اراکین کی تعداد 46 ہوگی جسکی تفصیل درج ذیل ہے۔

موجودہ وفاقی صدر اور جنرل سیکریٹری	2
ہر قومی اکائی سے 6	(30)
قومی اکائیوں کے صدور اور جنرل سیکریٹریز	10
Uk پارٹی	02
(گلگت بلتستان	01
جموں کشمیر	1
کل	46

(v) اگیزیکٹیو کمیٹی کا اجلاس 4 جنوری 2020 کو کراچی میں منعقد ہوگا جسمیں تمام صوبائی / قومی پارٹی یونٹس اپنی تحریری رپورٹ پیش کریں گے، وفاقی کانگریس کے لئے تمام قراردادوں کے مسودے اور اگر کوئی منشور یا دستور میں ترمیم پیش کرنا چاہے تو منظوری کے لئے پیش کرینگے۔

(vi) ڈرافٹ سیاسی دستاویز کو حتمی طور پر تیار کرنے کے لئے چار رکنی کمیٹی جس میں (1) اختر حسین (2) عاصم سجاد اختر (3) حیدر زمان (4) حمزہ ورک شامل ہیں، تشکیل دی گئی ہیہ کمیٹی حتمی طور پر ڈرافٹ اگست ہی کے مہینے میں تیار کر دیگی جسکو تمام صوبوں کی کانگریسوں میں بھی تقسیم کیا جائیگا۔ (6) ملکی اور بین الاقوامی سیاسی صورتحال پر تفصیلا بحث کے بعد بیان جاری کیا گیا، 23 اگست 2019 کو پورے پاکستان میں تمام پارٹی یونٹس زرعی اصلاحات مہنگائی، بیروزگاری، اور ٹریڈ یونینز ، پر پابندیوں کے خلاف بھرپور مظاہرے منظم کیے جائیں گے، اس سلسلے میں اپنی تمام دوست تنظیموں، DWF، PRSF ٹریڈ یونین فیڈریشنز، کسان / ہاری اور وکلاء تنظیموں اور دیگر ہمدردوں کو متحرک کیا جائے۔

بڑھتی ہوئی عسکریت پسندی نے جمہوریت کو تماشا بنادیا ہے

عوامی ورکرز پارٹی نے ۲۳ اگست کو مہنگائی کے خلاف

ملک گیر مظاہروں کا اعلان کردیا

لاہور۔ عوامی ورکرز پارٹی نے تمام ترقی پسند جمہوری قوتوں سے اپیل کی ہے کہ وہ بڑھتی ہوئی عسکریت پرستی کے پیش نظر متحد ہوجائیں جس نے جمہوریت کا تماشا بنادیا ہے۔ جس کا اظہار سینیٹ کے انتخاب میں ہارس ٹریڈنگ سے ہوتا ہے فیڈرل کمیٹی کے دو روزہ اجلاس کے بعد ایک مشترکہ بیان میں عوامی ورکرز پارٹی کے صدر یوسف مستی خان جنرل سیکریٹری اختر حسین اور ترجمان فاروق طارق نے ایک مشترکہ بیان میں تمام ٹریڈ یونینوں' کسانوں کی تنظیموں' تحریکوں اور گھریلو محنت کشوں کی یونینوں سے تحریک انصاف کی جانب سے آئی ایم ایف کے اشاروں پر بڑھتی ہوئی مہنگائی کے خلاف عظیم اتحاد پر زور دیا ہے انہوں نے کہا کہ عوام مخالف ان پالیسیوں کی وجہ سے محنت کشوں پر افراط زر اور بیروزگاری کا زبردست بوجھ لادھ دیا گیا ہے اور ان کا جینا محال کردیا گیا ہے عوام دوست گروپوں کا اتحاد ہے اسٹیبلشمنٹ کے سہارے چلنے والی تحریک انصاف کی حکومت کا مقابلہ کرسکتی ہے عوامی ورکرز پارٹی کے رہنماؤں نے کہا کہ اسٹیبلشمنٹ کی سامراجی پشت پناہی پاکستان کی جمہوری اقدار کو کمزور کررہی ہے۔ جس سے ملک کے اسٹریٹیجک جگہوں اور اثاثوں پر ان سامراجی اداروں کی رسائی بڑھتی جارہی ہے۔ عوامی ورکرز قیادت نے سپریم کورٹ کے جج عیسیٰ قاضی کے خلاف کاروائی کی بھرپور مخالفت کی انہوں نے افغانستان میں چلنے والے مذاکرات کو ملک میں طالبان کو دوبارہ اقتدار میں لانے کا ایک راستہ قرار دیا اور کہا کہ ٹرمپ جلد فوجیں نکالنے کے چکر میں ملک کو طالبان کے حوالے کرنا چاہتا ہے۔

عوامی ورکرز پارٹی کی قیادت نے کمرشل اور سوشل میڈیا اور تحریر و تقریر پر کھلے بندوں اور چھپی ہوئی پابندیوں کی بھی شدید مخالفت کی انہوں نے مطالبہ کیا کہ ممبران پارلیمنٹ علی وزیر اور محسن داوڑ کے پراڈکشن آرڈر جاری کیے جائیں اور بابا جان' مہر عبدالستار' افتخار کربلائی اور دیگر سیاسی اسیروں کو فوری رہا کیا جائے۔

(باقی صفحہ 35 پر ملاحظہ کیجیے)

بقیہ : اداریہ

حکومت کی بالادستی چیلنج ہوگی تو دوسری طرف یہ کونسل تجارتی پالیسی کو زیادہ بہتر اور عملی شکل دینے کے لیے اقدامات کی کرنے کی جرات نہیں کر سکے گی۔

بعض اقتصادی ماہرین کا کہنا ہے اس وقت عسکری اسٹیبلشمنٹ کے پچاس کے قریب تجارتی صنعتی ادارے کام کر رہے ہیں ان میں سے کئی ادارے ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں اب نئی اقتصادی کونسل معیشت کو مضبوط کرنے کے لیے ان اداروں سے ٹیکسوں کی وصولی کے بارے میں پالیسی بھی نہیں بنا سکے گی اور اس کی تیار کردہ ہر پالیسی پر عسکری اسٹیبلشمنٹ کی چھاپ ہوگی۔ سپریم کورٹ کے فاضل جج جسٹس گلزار احمد نے کراچی کنٹونمنٹ بورڈ کے علاقے سے تجاوزات ختم کرنے کے بارے میں اپنے ریمارکس میں کہا تھا کہ عام آدمی یہ سوال کرتا ہے کہ کنٹونمنٹ سے تجاوزات کیوں ختم نہیں کی جاتیں اب جب اقتصادی ترقی کی کونسل میں فوج کے سربراہ شامل ہوں گے تو پھر یہ سوال زیادہ شدت اختیار کر جائے گا اور چھوٹے صوبوں سے زیادہ شدت سے آوازیں آئیں گی کہ ان ساتھ امتیازی سلوک ہو رہا ہے اور مجموعی طور پر سول حکومت کی تمام اداروں پر بالادستی کمزور پڑ جائے گی فوجی حکومتوں کے ادوار میں چھوٹے صوبوں میں احساس محرومی بڑھا فوج اور عام آدمی میں خلا پیدا ہوا اب پھر ایسا ہوگا جو ملک کی یکجہتی کے لیے مفید ثابت نہیں ہوگا۔

بقیہ نجم الحسن عطا

حکومت دفاعی بجٹ میں اضافہ نہ کرنا کارنامے کے طور پر پیش کر رہی ہے مگر گذشتہ فروری میں بھارت سے کشیدگی کے بعد جی ایچ کیو کو سپلیمنٹری بجٹ کے طور پر 200 کروڑ روپے سے زائد کی رقم دی گئی تھی مگر جنرل ہیڈکوارٹر ہمیشہ اپنے بجٹ زیادہ رقم سپلیمنٹری بجٹ کے ذریعے حاصل کرتا ہے۔ موجودہ دفاعی بجٹ ملک کی مجموعی جی ڈی پی کے اعتبار سے زیادہ ہے۔ ملک کے اقتصادی بحران میں دفاعی بجٹ میں کمی ہونا ضروری تھی۔ ایف اے ٹی ایف کی پابندیوں کی بناء پر ملک کو سالانہ ایک بلین ڈالر سے زیادہ کا نقصان ہو رہا ہے۔ پھر ایف اے ٹی ایف نے الٹی میٹم دیا ہے کہ پاکستان نے 9 شرائط پوری نہیں کیں تو اکتوبر میں پاکستان کو بلیک لسٹ کر دیا جائے گا جس سے ملک کی رہی سہی معیشت بھی ختم ہو جائے گا۔ اس تمام تر اقتصادی بحران کے باوجود وفاقی حکومت خارجہ پالیسی کو تجارتی پالیسی سے منسلک کرنے کو تیار نہیں بلکہ اب بھی خارجہ پالیسی کو سیکیورٹی پالیسی کے تحت چلایا جا رہا ہے جس کے نتیجے میں پاکستان بین الاقوامی سطح پر پسپائی کا شکار ہے۔ ماہر اقتصادیات ڈاکٹر اکبر زیدی کا کہنا ہے کہ آئی ایم ایف سے معاہدہ ملک کی تاریخ کا بدترین معاہدہ ہے۔ اس معاہدے سے عام آدمی کی زندگی مزید اجیرن ہو جائے گا۔ ماہر اقتصادیات ڈاکٹر قیصر بنگالی نے پیشگوئی کی ہے کہ ڈالر کی قیمت 250 روپے تک جا سکتی ہے۔ جب سے روپیہ کی شرح کم ہوئی ہے ہر شعبہ کی قیمت بڑھ گئی ہے۔ حکومت نے اس بجٹ میں غیر ضروری درآمدات کو روکنے کے لیے ضروری اقدامات نہیں کیے۔ یوں اب حکومت بجلی اور پیٹرل کے بعد گیس کے نرخوں میں بھی 200 فیصد اضافہ کر رہی ہے۔ موجودہ حکومت نے برسراقتدار آنے کے بعد روپے کی قدر میں کمی کی تھی۔ اشیاء صرف کی قیمتوں میں 30 سے 40 فیصد تک اضافہ ہوا تھا۔ اب بجلی، گیس اور پیٹرل کے نرخوں میں اضافہ سے مہنگائی مزید بڑھ رہی ہے۔ حکومت کے دعووں کے باوجود ڈالر 160 روپے سے آگے پہنچ گیا ہے۔ وزیراعظم عمران خان بار بار دعویٰ کرتے ہیں کہ دو ماہ بعد حالات بہتر ہو جائیں گے مگر عمران خان کا وعدہ وفا نہیں ہوا اور ماہرین کہتے ہیں کہ اقتصادی بحران مزید بڑھے گا۔ حکومت آئی ایم ایف کے ایجنڈا پر عمل پیرا ہو کر قومی اداروں کی نجکاری کا منصوبہ شروع کرنے والی ہے۔ قومی صنعتی اداروں کی نجکاری کا تجربہ ماضی میں ناکام ثابت ہوا ہے۔ نجکاری کے نتیجے میں بے روزگار افراد کی تعداد بڑھے گی۔ نجی شعبہ کی تحویل میں جانے والے کارخانوں کی تیار کردہ اشیاء کی قیمتیں پھر بڑھ جائیں گی۔ اس صورتحال کے منطقی نتیجہ میں متوسط طبقہ بھی متاثر ہوگا اور نچلے طبقے کے افراد کے لیے خودکشی کے علاوہ کوئی اور راستہ باقی نہیں رہے گا۔ یہ وقت ہے کہ مزدور تنظیمیں دوبارہ منظم ہوں اور کارکنوں کو اپنے ساتھ ملائیں اور اس حکومت کے خاتمے کے لیے جدوجہد کا آغاز کریں۔ عوام کی جدوجہد ہی اس فرسودہ اقتصادی نظام کا خاتمہ کر سکتی ہے۔

بقیہ : خرم نیر

بائیں بازو کی سیاست آج ایک ایسے دوراہے پر کھڑا ہے جہاں ایک طرف حالات سازگار ہیں کہ عوام کا اس نظام پر سے بھروسہ اٹھتا جا رہا ہے اور مزاحمتی سیاست کی جگہ بن رہی ہے مگر دوسری جانب عوام کے مسائل کو این جی اوز اور سول سوسائٹی تنظیمیں تقسیم بھی کر رہی ہیں اور مدھم بھی۔ اس سارے کھیل میں بائیں بازو کے ان غداروں کا اہم کردار ہے جو ان این جی او سیکٹر سے وابستہ ہونے کے باوجود بائیں بازو کے ساتھ تعلقات استوار رکھتے ہیں۔ بائیں بازو کی تنظیموں اور افراد کو ان غداروں کے ساتھ پرانے تعلقات کو ایک طرف رکھتے ہوئے اس بات پر توجہ دینی چاہیے کہ یہ ایک تضاد پر مبنی اتحاد ہے کیونکہ بائیں بازو کا کام اجتماعی جدوجہد کو فروغ دیتے ہوئے معاشرے میں موجود تضادات کو تیز کر کے عوام کو نظام کے خلاف کھڑا کرنا ہے جبکہ سول سوسائٹی و این جی اوز کا

کام معاشرے میں انفرادی ایکٹوزم کو ابھار کر تضادات کو مدھم کر کے ں ظام کے اندر اصلاحات کرنا ہے۔

اس ہی طرح این جی اوز اور سول سوسائٹی کا گزر بسر ان جھٹکوں اور بحرانوں پر کام کرنا ہے جس کے لئے نیولبرل ریاستوں سے وہ پیسہ وصول کرتے ہیں اور جن بحرانوں کی آڑ میں یہ نظام مزید عوام دشمن پالیسیاں ترتیب دیتا ہے۔ بائیں بازو کا کام ان بحرانوں کے پیچھے کارفرما عوامل سے لوگوں کو آگاہ کرنا اور یہ سمجھانا ہے کہ یہ بحران بھی اس ہی نظام کی دین ہیں اور جب تک اس ں ظام کا خاتمہ نہیں ہوتا ان بحرانوں سے بھی نجات حاصل نہیں کی جا سکتی۔ چند بائیں بازو کے دوستوں کا یہ خیال ہوسکتا ہے کہ ہم سول سوسائٹی کے پلیٹ فارم کو اپنے لئے استعمال کر سکتے ہیں مگر میرے محدود تجربہ کی بنیاد پر میرا ماننا ہے کہ یہ سراسر گھاٹے کا سودا ہے جس میں جا کر ہم اپنی توانائیاں بھی ضائع کرتے ہیں اور لوگ بھی۔

دوسری جانب جتنا اہم مزاحمتی سوچ پر کام کرنا ہے اتنا ہی اہم اجتماعیت کی سوچ کو اجاگر کرنا بھی ہے۔ جب ہم نے این ایس ایف کا کام دوبارہ شروع کیا تو پہلا اسٹڈی سرکل ماؤ کی تحریر 'آزاد خیالی کا مقابلہ کرو' پر کیا تھا مگر آج نئی آزاد خیالی کا مقابلہ کرنے کی ضرورت ہے۔

بقیہ محمد سعید

مارکس قومی مسئلے کے حل پر زور دیتا ہے اور یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اس مسئلے کو ٹھوس تاریخی حالات کے مطابق طے کیا جائے قومی سوال کا مافیہ تبدیل ہوتا رہتا ہے اس لحاظ سے اس کی سیاسی شکلیں بھی تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔

اس مسئلے کو مناسب طور پر حل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مختلف ادوار میں نشو ونما' ملک کی نشو ونما کی منفرد خصوصیات کو دنیا میں اور مذکورہ ملک کے اندر طبقاتی قوتوں کو' مختلف قوموں کے محنت کش عوام کی سرگرمیوں اور سماجی شعور' تنظیم کی سطح کو پیش نظر رکھا جائے مارکس نے قومی سوال پر طبقاتی نقطہ نظر سے غور کیا اس صورت میں بھی جب کوئی خاص قومی جدوجہد ترقی پسندانہ خطوط پر حاوی ہو پرولتاریہ کے لیے لازم ہے کہ وہ بورژوا سے اپنی طبقاتی آزادی کو بچا کر رکھے مارکس نے نزدیک قومی آزادی کی تحریکیں مقصود بالذات نہیں ہیں بلکہ ناگزیر طور پر عالمی انقلاب کے عمل اس کے مفادات اور حکمت عملی کی مناسبت سے دیکھنے کی ضرورت ہے

یہ بات غور طلب ہے کہ مزدور طبقے کی معاشی نجات وہ عظیم مقصد ہے جس کا سیاسی تحریکوں کو بطور وسیلہ خدمت گزاری کرنی چاہیے محکومیت کی نجات مقامی اور قومی نہیں بلکہ ایک سماجی فریضہ ہے ہم ایک انسان کے خلاف دوسرے انسان کے استحصال کا خاتمہ چاہتے ہیں اور اس طرح وہ ایک قوم کے ہاتھوں دوسری قوم کے استحصال کو مسترد کرتے ہیں جب طبقات کے درمیان تفریق ختم ہوجائے گی تو قوموں کے درمیان نفرت باقی نہیں رہے گی۔☆☆

بقیہ : مہناز رحمن

اسی طرح پیشے بھی مردانہ اور زنانہ بنا دیئے گئے ہیں۔ طاقت اور اختیارات کے ڈھانچے بھی غیر مساوی ہیں جو عورتوں کو محکوم رکھتے ہیں۔

اسی لیے لیبر مارکیٹ میں بھی عورتیں گھاٹے میں رہتی ہیں۔ آجر سمجھتے ہیں کہ گھریلو ذمہ داریوں کی بنا پر عورتیں کارخانوں یا اداروں میں اتنی اچھی طرح کام نہیں کر پائیں گی۔ مردوں جتنا کام کرنے کے باوجود عورتوں کو کم معاوضہ دیا جاتا ہے۔ اکثر کام کی جگہ پر عورتوں کو تشدد' جنسی ہراسانی اور امتیازی سلوک کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس صورتحال کو تبدیل کرنے میں ٹریڈ یونینز اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔ یہ عالمگیریت کا دور ہے جو نیولبرل' ریفارمز' مارکیٹ اور تجارت کی لیبر لائزیشن اور نجکاری سے جڑا ہوا ہے۔ صنفی مساوات اور کمزور طبقات کے مفادات کی حفاظت کے لیے کی جانے والی اصلاحات پر عمل درآمد ریاست کی ذمہ داری ہے۔ لیکن ریاست کا کردار کمزور پڑتا جا رہا ہے۔ جب ریاست کمزور ہوگی تو وہ یہ ذمہ داریاں پوری کرنے میں ناکام رہے گی۔

آج جب مہنگائی اور بے روزگاری نے لوگوں کی زندگی اجیرن کر دی ہے' کرپشن کی وجہ سے ریاست بحران کا شکار ہے' اس وقت ہمیں شانتا بخاری جیسے لوگوں کی پہلے سے بھی کہیں زیادہ ضرورت ہے۔ سماجی انصاف پر مبنی فلاحی ریاست میں عوام خاص طور پر عورتوں کے مسائل حل کر سکتی ہے۔☆☆

بقیہ: پریس ریلیز

عوامی ورکرز پارٹی نے بلوچستان اور دیگر علاقوں سے مسنگ پرسنز کی فوری بازیابی کا مطالبہ کیا اور کہا کہ بلوچستان کے اشیو پر تمام اسٹیک ہولڈرز سے مذاکرات کر کے حل کیا جائے۔ عوامی ورکرز پارٹی نے پی ٹی آئی حکومت کی معاشی پالیسیوں کو مکمل مسترد کرتے ہوئے کہا کہ ٹیکسوں کی بھرمار سے معیشت سنبھالنے کا دکھاوا صرف دھوکا ہے انہوں نے کہا کہ غیر ملکی قرضہ جات سوا ارب ڈالر سے تجاوز کر گئے اور آئی ایم ایف نیولبرل پالیسوں کے تیزی سے نفاذ پر عمل کرنے میں مزید تیزی دکھانے کا مطالبہ کر رہا ہے۔ عوامی ورکرز پارٹی نے بلوچستان میں پبلک سیکٹر کی ۶۲ ٹریڈ یونینز پر سے فوری طور پر پابندی اٹھانے کا مطالبہ کیا خیبر پختونخواہ اسمبلی کی جانب سے عورت مارچ کے خلاف تحریک منظور کیے جانے کی شدید مذمت کی گئی۔ عوامی ورکرز پارٹی نے سینٹر حاصل بزنجو کے ساتھ مکمل یکجہتی کا اظہار کیا۔ عوامی ورکرز پارٹی نے زرعی اصلاحات کے نفاذ مہنگائی بیروزگاری اور مجوزہ نجکاری کے خلاف ۲۳ اگست کو ملک گیر مظاہروں کا اعلان کیا ہے اور اپنے یونٹوں سے اپیل کی ہے کہ اس میں بھرپور حصہ لیں۔☆☆

میرے شہر میں ترقی ہو رہی ہے

خرم نیر

سنتا ہوں......
میرے شہر میں ترقی ہو رہی ہے
میرے کچے مکانوں کو گرا کر
میری چھوٹی دکانوں کو مٹا کر
میرے شہر میں ترقی ہو رہی ہے
عمارتیں اب کے اور بھی اونچی بنیں گی
بسیں اے سی والی سڑکوں پر چلیں گی
نئے محلے خوشحالی کے عکاس ہوں گے
اور ہم افتادگان جو نہ آس پاس ہوں گے
آرکیٹکٹس نئے خواب بن رہے ہیں
اور خواب اپنے چکنا چور ہو رہے ہیں
مگر خاموش رہنے کا حکم ہے
کچھ بھی نہ کہنے کا حکم ہے
کیونکہ......
میرے شہر میں ترقی ہو رہی ہے
سنا ہے جس جگہ میرا کنواں تھا
اب وہاں ہائیڈرنٹ کا کاروبار ہوگا
اور وہ پانی مری دسترس سے باہر ہوگا
سنا ہے وہ ندی جو مری زندگی تھی
اس کی بجری نیلام کر دی گئی ہے
وہاں اب فائیو اسٹار تعمیر ہوگا
اور دنیا بھر سے مفکروں کو بلا کر
ان کی میزوں پر پانی کی بوتل لگا کر
مباحثوں کا اہتمام ہوگا
بحث کہ انڈیجینئس رائٹس کا دفاع ہو
دفاع ہو ماحولیات کا دفاع ہو
مگر پھر......

میری دھرتی پر کئی پہریدار بیٹھیں گے
جو میں انڈیجینئس اس زمیں پہ جانا چاہوں گا
جس سے میری تاریخ میرا بچپن وابستہ ہے
میری تہذیب میرا کلچر وابستہ ہے
مجھے یہ کہہ کر روکا جائے گا
کہ میں کلچرڈ نہیں ہوں
میں مہذب نہیں ہوں
اس دھرتی پر قدم رکھنے کے
قابل ہی نہیں ہوں
سنا ہے جس جگہ پر وہ شجر تھا
جہاں بچپن میں ہم جھولے جھولتے تھے
جہاں جوانوں کے عشق پھلتے پھولتے تھے
وہاں اب امیوزمنٹ پارک بننے جا رہا ہے
جہاں اب جھولنے کو دولت چاہیے ہوگی
اور محبت بھی اک بیوپار ہوگی
قدرت نے عطا کیے جو جھولے
میرے بچوں سے وہ بھی چھن چکے ہیں
میرا عشق میری یادیں مرے سب پل
سرمائے کی دنیا میں کہیں گم ہو چکے ہیں
میری تاریخ اب پسماندگی کی داستاں ہے
میرے حصے میں صرف ذلتِ جہاں ہے
مگر خاموش رہنے کا حکم ہے
کچھ بھی نہ کہنے کا حکم ہے
کیونکہ......
میرے شہر میں ترقی ہو رہی ہے
میرے شہر میں ترقی ہو رہی ہے

☆☆

☆

اشاعت کا
50 واں سال

Monthly AWAMI JAMHURIAT

عوامی جمہوریت

ماہنامہ جولائی/اگست 2019ء

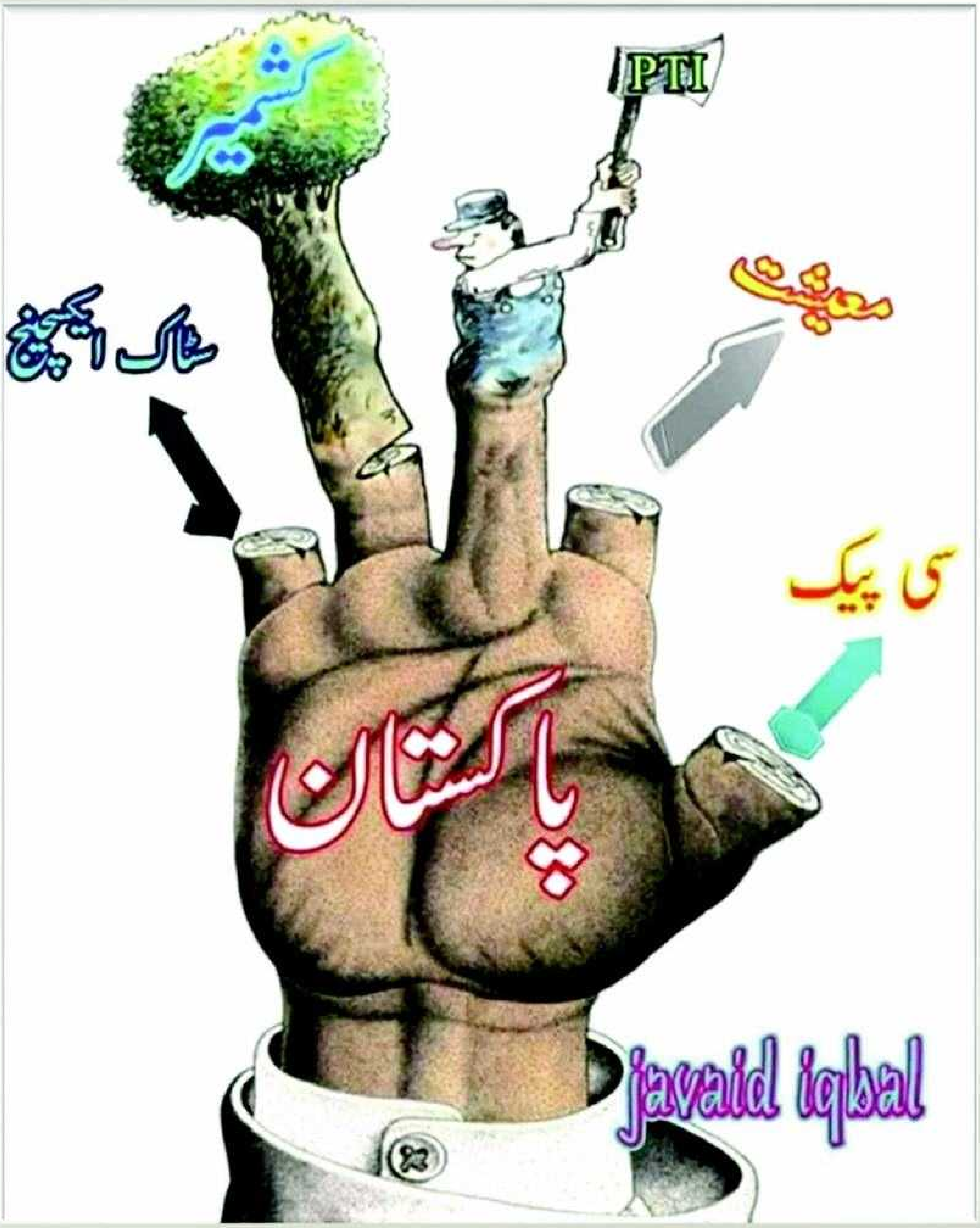

کوئٹہ

شانگلہ

ملتان

اسلام آباد

مردان

لاہور

لاڑکانہ

کراچی

سانگھڑ

اوکاڑہ

سلامتی کونسل

احمد فراز

پھر چلے ہیں میرے زخموں کا مداوہ کرنے
میرے غم خوار اسی فتنہ گر دہر کے پاس
جس کی دہلیز پہ ٹپکی ہیں لہو کی بوندیں
جب بھی پہنچا ہے کوئی سوختہ جاں کشتۂ یاس
جس کے ایوانِ عدالت میں فروکش قاتل
بزم آرا و سخن گستر و فرخندہ لباس
ہر گھڑی نعرۂ زناں ، امن و مساوات کی نیر
زر کی میزان میں رکھے ہوئے انسان کا ماس

کون اس قتل گہہ ناز کے سمجھے اسرار
جس نے ہر دشنہ کو پھولوں میں چھپا رکھا ہے
امن کی فاختہ اڑتی ہے نشاں پر لیکن
نسلِ انساں کو صلیبوں پہ چڑھا رکھا ہے
اس طرف نطق کی باران کرم اور ادھر
کاسۂ سر سے مناروں کو سجا رکھا ہے
جب بھی آیا ہے کوئی کشتۂ بیداد اسے
مرہم وعدۂ فردا کے سوا کچھ نہ ملا
یہاں قاتل کے طرفدار ہیں سارے قاتل
کاہش دیدۂ پرخوں کا صلہ کچھ نہ ملا
کاشمیر کوریا ویتنام ڈومنکن کانگو
کسی بسمل کو بجز حرف دعا کچھ نہ ملا

قصر انصاف کی زنجیر ہلانے والو
کجکلاہوں پہ قیامت کا نشاں ہے طاری
اپنی شمشیر پہ کشکول کو ترجیح نہ دو
دم ہو بازو میں تو ہر ضرب جنوں ہے کاری
اس جزیرے میں کہیں نور کا مینار نہیں
جس کے اطراف میں اک قلزم خوں ہے جاری

جوہر جام جم از کان جہاں و گر است
تو توقع ز گل کوزہ گراں می داری

لاڑکانہ

کراچی

سانگھڑ

اوکاڑہ

سلامتی کونسل

احمد فراز

پھر چلے ہیں میرے زخموں کا مداوہ کرنے
میرے غم خوار اسی فتنہ گر دہر کے پاس
جس کی دہلیز پہ ٹپکی ہیں لہو کی بوندیں
جب بھی پہنچا ہے کوئی سوختہ جاں کشتۂ یاس
جس کے ایوانِ عدالت میں فروکش قاتل
بزم آرا و سخن گستر و فرخندہ لباس
ہر گھڑی نعرہؑ زناں ، امن و مساوات کی نیر
زر کی میزان میں رکھے ہوئے انسان کا ماس

کون اس قتل گہہ ناز کے سمجھے اسرار
جس نے ہر دشنہ کو پھولوں میں چھپا رکھا ہے
امن کی فاختہ اڑتی ہے نشاں پر لیکن
نسلِ انساں کو صلیبوں پہ چڑھا رکھا ہے
اس طرف نطق کی باران کرم اور ادھر
کاسۂ سر سے مناروں کو سجا رکھا ہے
جب بھی آیا ہے کوئی کشتۂ بیداد اسے
مرہم وعدۂ فردا کے سوا کچھ نہ ملا
یہاں قاتل کے طرفدار ہیں سارے قاتل
کاہش دیدۂ پرخوں کا صلہ کچھ نہ ملا
کاشمیر کوریا ویتنام ڈومنکن کانگو
کسی بسمل کو بجز حرف دعا کچھ نہ ملا

قصر انصاف کی زنجیر ہلانے والو
کجکلاہوں پہ قیامت کا نشاں ہے طاری
اپنی شمشیر پہ کشکول کو ترجیح نہ دو
دم ہو بازو میں تو ہر ضرب جنوں ہے کاری
اس جزیرے میں کہیں نور کا مینار نہیں
جس کے اطراف میں اک قلزم خوں ہے جاری

جوہر جام جم از کان جہاں و گر است
تو توقع ز گل کوزہ گراں می داری